حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر۔۱۶

فضل حق آزاد

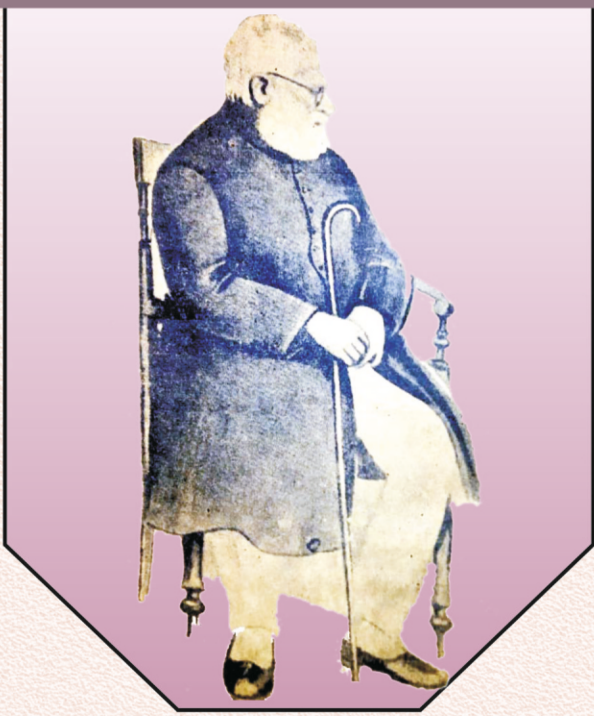

پروفیسر محمد حامد علی خاں

Monograph-16

Fazl-e-Haque Azad

By : Prof. Md. Hamid Ali Khan

علامہ حافظ سید فضل حق آزاد دبستان بہار کے ایک قد آور شاعر کے علاوہ ایک نثر نگار اور صحافی بھی تھے۔ بزم آرائی ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ انھوں نے چھ دہائیوں تک شعر وادب کی محفلیں آراستہ کیں اور بڑی شان سے زندگی گزاری۔ اہل علم آزاد کی علمی وسعت، دانشوری اور سخن دانی کے معترف ہیں۔

فضل حق آزاد جہان آباد ضلع کے شاہو بگہہ بستی میں ایک زمیندار گھرانے میں ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر فدا حسین تھا۔ ان کا پورا گھرانا مشرقی اور دینی علم وتہذیب کا پروردہ تھا۔ ابتدائی تعلیم عربی وفارسی میں ہوئی پھر انھیں حفظ کرایا گیا۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول لئے پٹنہ چلے آئے۔

آزاد کو غزل اور نظم دونوں اصناف پر مقدرت حاصل تھی۔ ابتداء میں ان کی غزلوں میں عمومی رنگ تھا۔ پھر اس پر اخلاقی اور سیاسی افکار نمایاں رہے۔ اس کے بعد آزاد نے ایک ایسا رنگ اختیار کیا، جسے ہم ان کے شعری آہنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

چھ دہائیوں تک شعر وادب کی بزم آرائیوں نے جہاں ایک طرف صحت مند ادبی ماحول کی تعمیر کے ساتھ آزاد کو شہرت وشناخت عطا کی، وہیں اُن کے شعر وسخن کی آبیاری بھی ہوتی رہی۔ جس کے سبب ان کا کلام ادب کا ایک قیمتی سرمایہ بن گیا۔

اس فردنامے کے مصنف پروفیسر محمد حامد علی خاں ایک ادیب، محقق اور ناقد کی حیثیت سے اپنی نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ بی. آر. امبیدکر بہار یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک مقبول استاد کی حیثیت سے برسرِ کار ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر اپنی علمیت سے دنیائے ادب کو مستفید کر رہی ہیں۔

فضل حق آزاد پر ان کا یہ فردنامہ پوری تحقیق اور نہایت سلیقے سے لکھی ہوئی ایک قابل قدر تصنیف ہے، جس کے مطالعے سے ہمیں آزاد کی شخصیت، شاعری، تنقیدی شعور، نثر نگاری اور صحافت سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے اور ان کی ایک مجموعی ادبی قدر وقیمت ہمارے سامنے روشن ہو جاتی ہے۔

—— اسلم جاوداں

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

فضل حق آزاد عظیم آبادی

پروفیسر محمد حامد علی خاں

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔۱۶

Fazl-e-Haq Azad Azimabadi

By

Prof. Md. Hamid Ali Khan

نام کتاب	:	فضل حق آزاد عظیم آبادی
مصنف	:	پروفیسر محمد حامد علی خاں
سال اشاعت	:	2022ء
کل صفحات	:	112
کمپوزنگ	:	ریاض احمد خاں، دی پرنٹ زون، قادری کمپلیکس، پٹنہ
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔٦

ملنے کا پتہ :
اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱
فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

فہرست

پیش لفظ	احمد محمود	4
ابتدائیہ	پروفیسر حامد علی خاں	6
فضل حق آزاد: ایک نظر میں	—	8
فضل حق آزاد: مہد سے لحد تک	—	10
آزاد کی غزل گوئی	—	18
آزاد بحیثیت نظم نگار	—	23
آزاد کی قصیدہ نگاری	—	30
آزاد کی مثنوی نگاری	—	37
آزاد کی غنائی شاعری	—	40
آزاد کی رباعی نگاری	—	47
آزاد اور اردو صحافت	—	49
آزاد کا شعور نقد	—	54
آزاد کی نثر نگاری	—	62
ضمیمہ	—	67
انتخابِ کلام	—	71
کتابیات	—	112

پیش لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری و ادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعروادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر، شوق نیموی، فضلِ حق آزاد،، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجز، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری و ادبی عظمت و اہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری و ادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعروادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں دس مشاہیر ادب بہار ۱۔ شاد عظیم آبادی، ۲۔ پرویز شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہی، ۵۔ علامہ واقف عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمز عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفر پوری، ۱۰۔ کلیم عاجز کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا نیز مزید مشاہر دبستان بہار پر فردنامے کی اشاعت کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ نے دانشوران شعروادب کی ایک اہم مشاورتی نشست میں مشوروں کے

بعد اتفاق رائے سے مزید ۳۲ فرد ناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا۔ جن گراں قدر ادبی شخصیتوں پر فرد ناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا گیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امداد امام اثر، ۲۔ فضل حق آزاد عظیم آبادی، ۳۔ شوق نیموی، ۴۔ انجم مانپوری،
۵۔ یاس یگانہ چنگیزی، ۶۔ بیدل عظیم آبادی، ۷۔ قاضی عبدالودود، ۸۔ جمیل مظہری،
۹۔ اختر اورینوی، ۱۰۔ سہیل عظیم آبادی، ۱۱۔ شکیلہ اختر، ۱۲۔ حسن نعیم، ۱۳۔ غیاث احمد گدی،
۱۴۔ کلام حیدری، ۱۵۔ احمد یوسف، ۱۶۔ صدیق مجیبی، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ اویس احمد دوراں، ۱۹۔ لطف الرحمٰن، ۲۰۔ اسرار جامعی، ۲۱۔ جمیلہ خدابخش، ۲۲۔ رشیدۃ النساء،
۲۳۔ بیتاب صدیقی، ۲۴۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۵۔ راسخ عظیم آبادی، ۲۶۔ عبدالغفور شہباز،
۲۷۔ پیغام آفاقی، ۲۸۔ غلام سرور، ۲۹۔ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ۳۰۔ مظہر امام،
۳۱۔ اجتبیٰ رضوی، ۳۲۔ کیف عظیم آبادی۔

سید فضل حق آزاد عظیم آبادی دنیائے سخن کے ایک ایسے بلند مرتبہ شاعر تھے، جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ نا صرف یہ کہ اردو شعر و سخن کے خزانے میں گراں قدر اضافہ کیا، بلکہ دبستانِ بہار کا نام بھی روشن کیا۔ آزاد کو اردو شاعری کے تمام اصناف پر قدرت اور مہارت حاصل تھی۔

پروفیسر محمد حامد علی خاں اردو ادب کے ایک معتبر اور معروف ناقد و ادیب ہیں۔ یہ بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں استاد کی حیثیت سے تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

فضل آزاد پر پروفیسر حامد علی خاں کا یہ فرد نامہ پوری تحقیق کے ساتھ پیش کردہ ایک کامیاب تصنیف ہے، جو فضل حق آزاد کی شخصیت اور فن کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔

ہم بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی کی تفہیم میں یہ فرد نامہ اردو ڈائرکٹوریٹ کی ایک کامیاب پیش کش ہے۔

احمد محمود
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

جو سچ کہوں تو میری کوئی شناسائی حافظ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی سے باضابطہ نہ تھی لیکن اپریل ۲۰۲۰ء کی کوئی تاریخ تھی کہ ڈاکٹر اسلم جاوداں صاحب کا فون پر یہ حکم صادر ہوا کہ آپ کو فضل حق آزاد پر ایک فرد نامہ (مونوگراف) تیار کرنے کی ذمہ داری دی جاتی ہے۔ میں نے ماضی کے تابندہ اوراق کو کبھی قصہ پارینہ نہیں سمجھا، چنانچہ اس ادبی حکم کو قبول کرلیا۔ میل پر معاہدہ نامہ بھی آ گیا۔ اب سامنے تھا انسانی زندگی پر سیاسی شب خون کا منظر (کورونا) پھر رفتہ رفتہ سیاسی ضرورت کے تحت زندگی کے کچھ حصے کو آزادی ملی کہ سامنے تھا حکومت سازی کا مرحلہ لیکن کالج، کتب خانوں اور اسکولوں کے در پر کھڑا رہا کورونا۔ تاریخ تحریک دے رہی تھی کہ علمی و ادبی کاموں کا سلسلہ نامساعد حالات میں بھی جاری رہا ہے۔ چنانچہ میری ذاتی ملکیت اور احباب کے تعاون نے میری حوصلہ افزائی کی اور یہ فرد نامہ تیار ہوا۔

علامہ حافظ سید فضل حق آزاد نے بہت اچھی عمر پائی (پ: ۱۸۵۴ء۔ و: ۱۹۴۲ء)۔ انھوں نے شعر و ادب کی دنیا کا وہ عہد زریں دیکھا جس میں سر سید خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، اکبر الٰہ آبادی، علامہ اقبال، صفیر بلگرامی، عبدالغفور شہباز اور شاد کو ملکہ حاصل تھا۔ جناب آزاد نے جاگیردارانہ فضا میں پرورش پائی تھی، لیکن ان کے حصے میں صرف مشرقی و مذہبی علوم کی ہی سند میسر رہی۔ لکھنؤ کے مشہور استاد قاری محمد جان جن کی قرأت کا سکہ پورے اتر پردیش میں رائج تھا، کی نگرانی میں اپنے وطن شاہو بگہہ ہی میں رہ کر حافظ قرآن ہوئے تو استاد کی قرأت بھی ایسی اتاری کہ امام حرم نے بھی قرأت کی سند دے دی۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر ایسی دسترس حاصل کی کہ تینوں زبانوں پر عبوریت کا احساس عہد متعلقہ کے تمام اہل علم کو ہوا۔ حالی، شبلی، اسلم جیراجپوری کے علاوہ نیاز فتحپوری نے بھی انہیں اہم شاعر گردانا ہے کیونکہ سید فضل حق آزاد کو غیر معمولی تخلیقی صلاحیت میسر تھی۔ اردو شعر و ادب کی مختلف اصناف پر یکساں

دسترس حیرت انگیز تھی کہ آزاد نے غزلیں کہیں تو نظمیں بھی خوب کہیں، قصیدے لکھے تو غنائیہ شاعری کا پاس بھی رکھا، رباعی نگاری کے میدان میں تجربے کیے تو قطعات و مستزاد بھی لکھے۔ ادبی معیار و اوزان پر شادؔ، شوقؔ اور اقبالؔ سے معرکے بھی کیے۔

علامہ سید فضل حق آزاد نے اسالیب شاعری کے علاوہ قومی و ملّی جذبے کے تحت تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ انشائیے بھی لکھے اور عوام سے رابطے کی خاطر صحافت سے رشتہ جوڑا تو ستمبر ۱۹۰۲ء میں پندرہ روزہ اخبار ''تاج'' بھی جاری کیا۔ جس نے صرف بارہ شماروں پر آخری سانس لی۔

شادؔ عظیم آبادی، شوق نیموی اور علامہ اقبال سے ان کے منظوم و منثور ادبی معرکے بھی ہوئے۔ ''الپنچ''، پٹنہ اور جامعہ'' دلی میں ان کے معرکوں کا معیار دیکھا جاسکتا ہے، جس میں تعمیری پہلو کے ساتھ ساتھ کچھ بیزارکن یکسانیت بھی تھی۔ چنانچہ میں نہیں کہتا کہ علامہ سید فضل حق آزادؔ کوئی ایسے فن کار تھے جنہیں فوق العادات یا فوق الفطری وجود تصور کیا جائے۔ لیکن اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ ان کے اندر تخلیقی وحدت کی ایسی توانائی موجود تھی جس کی وجہ سے وہ اس مقام تک گئے جہاں مایہ، فکر، اسلوب فکر اور ترسیل فکر کی وحدت نے انہیں صاحب کمال فن کار کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔ افسوس کہ ان کا کوئی شعری یا نثری مجموعہ شائع نہ ہوسکا سوائے رخت وصال ۱۳۲۷ھ کے، جو غنائی شاعری کا نمونہ ہے۔

(پروفیسر) محمد حامد علی خاں
مظفرپور

فضل حق آزاد : ایک نظر میں

- نام : سید فضل حق
- تخلص : آزاد
- قلمی نام : آزاد عظیم آبادی
- ولادت : ۱۸۵۴ء
- والد : میر فدا حسین
- وفات : ۲۷رشعبان ۱۳۶۱ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۲ء
- وطن : موضع شاہو بگہہ، ضلع ۔ گیا، موجودہ ضلع ۔ جہان آباد
- تعلیم : مقامی علماء کی نگرانی میں ابتدائی عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم حاصل کی۔ پھر لکھنؤ کے مشہور حافظ قاری محمد جان کو شاہو بگہہ بُلوا کر حفظ قرآن مکمل کرائی گئی۔ بعد ازاں تکمیل قرأت اور شرح جامی تک تعلیم مکمل کی۔ ۱۸۹۱ء میں مناسک حج کے بعد ایک سال تک ریاض کے بعد امام حرم سے قرآت کی سند حاصل کی۔ اس کے علاوہ فضل حق آزاد کو کسی مدرسے، اسکول اور کالج کی کوئی سند میسر نہ رہی۔
- رفاقت : شادؔ عظیم آبادی، قاضی سید رضا حسین، شوق نیموی، سرسید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، سید مہدی علی محسن الملک وغیرہم۔
- شادی : ۱۸۹۲ء
- اہلیہ : محل اولیٰ: دختر شیخ نثار حسین رئیس، لودی کٹرہ مشہور بہ شیخ کنواں۔
محل ثانی: عمدۃ النساء، موضع ۔ سائیں، ضلع ۔ گیا، موجودہ ضلع ۔ جہان آباد۔
- اولاد : محل اولیٰ سے چار لڑکے نور الحق بیرسٹر، شمس الحق بیرسٹر، عبدالحق ترکی فوج کے اعلیٰ افسر، عزیز الحق عظیم آبادی (فضل حق آزاد کی وراثت سنبھالی) اور تین

لڑکیاں تھیں۔
محل ثانی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔

- ملازمت: کوئی ملازمت نہیں کی۔ وراثتاً زمیندار تھے۔
- تخلیقی سفر: تقریباً بارہ سال کی عمر میں شعر گوئی کا ذوق ہوا۔
- شرف تلمذ: یہ شعر ہی کافی ہے۔

آزاد ہوں، ہے طبع بھی اپنی آزاد — میں کیا جو رکھوں نظم سخن کی بنیاد
اس فن سے مناسبت فقط ہے ورنہ — شاگرد کسی کا، نہ کسی کا استاد

- اعزاز: علامہ
- تخلیقات: (۱) ''رخت وصال'' بہ وصال سید شاہ اکبر داناپوری، ۱۹۰۹ء تقطیع ۲۰×۱۴ سنٹی میٹر، بشکل کتابچہ۔

(۲) عہد متعلقہ کے تمام اہم رسائل وجرائد میں اردو وفارسی میں شعری تخلیقات نظم، غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، غنائی نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ نثری تحریریں بھی شائع ہوئیں۔ شاد، اقبال اور شوق نیموی سے معرکے بھی شائع ہوئے پر کوئی مجموعہ شائع نہ ہوا۔

- صحافت: پندرہ روزہ اخبار ''تاج'' کا اجرا، ۱۵رستمبر ۱۹۰۲ء کو پٹنہ سے کیا۔ لیکن سولہ (۱۶) شماروں کے بعد تاج نے آخری سانس لی۔
- دعویٰ:

خاک ہوں پر توتیا ہوں چشم مہر وماہ کا
آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا

یہ بستی اب بھی بازارِ ختن ہے باکمالوں سے
غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے

فضل حق آزاد: مہد سے لحد تک

ضلع جہان آباد (سابق ضلع گیا) سے دس میل پورب دکھن میں واقع سادات کی ایک مختصر سی بستی شاہو بگہہ کے ایک زمیندار میر فدا حسین کو اللہ نے آٹھ اولادیں عطا کیں جن میں دو لڑکے سید فضل حق اور سید محبّ الحق جب کہ چھ بیٹیاں تھیں۔ سید فضل حق کی پیدائش اسی موضع شاہو بگہہ میں ۱۸۵۴ء کے اواخر میں ہوئی۔ سید فضل حق کا پورا خانوادہ چونکہ مشرقی اور دینی علوم کا پروردہ تھا اس لیے ان کے والد میر فدا حسین نے بھی سید فضل حق کی ابتدائی تعلیم عربی وفارسی کتابوں سے کرائی جس کے لیے مقامی علماء کی نگرانی بھی دی گئی۔ لیکن سید فضل حق کی ذہانت، حاضر جوابی اور حافظے کو دیکھتے ہوئے میر فدا حسین نے بیٹے کو حافظ قرآن بنانے کی فکر کی تو لکھنؤ کے مشہور حافظ قاری محمد جان کو دعوت دی گئی اور انہیں لکھنؤ سے شاہو بگہہ بلا کر ان کی پوری کفالت کی ذمہ داری لیتے ہوئے قاری محمد جان کی نگرانی وسرپرستی میں سید فضل حق کو حافظ قرآن بنایا گیا۔ ہر چند کہ قاری محمد جان کی شاگردی میں سید فضل حق کے چھوٹے بھائی سید محبّ الحق نے بھی حفظ کی مشاقی شروع کی تھی پر ان سے یہ بار گراں اٹھائے نہ اُٹھا جبکہ کلکتہ ہائی کورٹ کے مشہور وکیل بعد ازاں نصیر المہام سرکار بھوپال، سید عنایت کریم، پھوپھی زاد بھائی فصیح الدین مختار محلّہ دریاپور پٹنہ اور حسن التوحید صاحبان نے ان کی نگرانی میں حافظ قرآن ہونے کی سند حاصل کی لیکن استاد قاری محمد جان کی قرأت کا ملکہ صرف سید فضل حق کو میسر آیا۔ یعنی جناب فضل حق کو وہ قرأت میسر آئی کہ جب قرأت کرتے تو سامعین پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس طرح حفظ قرآن اور تکمیل قرآت کے بعد درسیات میں شرح جامی تک کی تعلیم شاہو بگہہ میں ہوئی سید فضل حق نے اپنی ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں از خود یوں عرض کیا ہے کہ:

''عربی کتابیں، صرف ونحو، منطق وحکمت کچھ گھر پر پڑھیں کچھ پٹنہ میں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنا استاد آپ رہا۔''[1]

اور حفظ قرآن وقرأت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''تیرہواں سال لگا ہوگا کہ میں حافظ قرآن ہوا اور اس مسجد میں محراب سنائی جو اسی نیت سے بنائی گئی تھی۔ ایک منظوم رسالہ بھی لکھا ہے۔'' [۲]

گویا شعر گوئی کا ذوق بھی انہیں کچی عمر میں ہی میسر آ گیا تھا اور اپنے نام کے ساتھ آزاد کا اضافہ کر سید فضل حق آزاد ہو گئے اور بقول سید بدر الدین احمد:

''حضرت فضل حق آزاد جب گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کر چکے تو عربی اور فارسی کی انتہائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے پٹنہ چلے آئے۔ ان کے ایک عزیز میر لطیف حسین محلّہ رانی پور میں رانی پور اسٹیٹ کے تحصیل دار اور مختار عام بھی تھے۔''

حضرت فضل حق آزاد بہت دنوں تک رانی پور میں ان کے ساتھ رہے۔ خان بہادر قاضی سید رضا حسین کی یہیں سسرال تھی اور ان کی اہلیہ رانی پور اسٹیٹ کی شریک مالکہ بھی تھیں اس لئے قاضی رضا حسین صاحب بھی یہیں رہتے تھے۔ حضرت فضل حق آزاد پر قاضی رضا حسین کا کافی اثر پڑا۔ چونکہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے اس لئے یہ بھی قاضی صاحب کے ساتھ قومی تحریکوں میں شریک ہونے لگے اور یہ جذبہ جب اور بڑھا تو ان تحریکوں کو کامیاب بنانے کے لئے یہ بھی باہر جانے لگے۔ ایک دفعہ سر سید کے ساتھ جامعہ علی گڑھ کے لئے چندہ جمع کرنے حیدرآباد گئے اس وفد میں مولانا شبلی اور مولانا حالی بھی شریک تھے۔'' [۳]

دراصل قاضی سید رضا حسین صاحب سے فضل حق آزاد کے والد میر فدا حسین کی دوستانہ قربت تھی اور جب فضل حق آزاد نے حفظ قرآن اور درسیات کی تعلیم مکمل کر لی تو قاضی سید رضا حسین شاہو بگہہ پہنچے اور میر فدا حسین سے فضل حق آزاد کو مانگ لیا کہ ان کی مزید ذہنی صلاحیت کو ابھارنے کے لیے پٹنہ جانے کی اجازت دی جائے۔ انہیں میری نگرانی میں اپنے ذوق علم وادب کو ابھارنے کے مواقع میسر ہوں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عظیم آباد میں قاضی سید رضا حسین کی انجمن نے فضل وکمال کی نکہت سے بہار

۱۔۲ صدائے عام، پٹنہ، عید نمبر ۱۹۵۰ء، ص ۸۳،

۳ حقیقت بھی کہانی بھی، ناشر بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ، ۲۰۰۳ء، ص ۴۴۔۵۴۵

کی ادبی فضا پر ایک وجدسی طاری کر رکھی تھی۔ کیونکہ ان کی انجمن میں محسن قوم سر سید احمد خاں اردو شعر وادب کو تربیت یافتہ بنانے والے خواجہ الطاف حسین حالی اور منور ادیب وانشا پرداز مؤرخ وسیرت نگار علامہ شبلی نعمانی بھی ان کی انجمن میں آیا کیے تھے۔ جس سے فضل حق آزاد کے ذوق وشوق کو نکھرنے کے مواقع ملے۔ متذکرہ اقتباس میں جس سفر حیدرآباد کا ذکر ہے وہ دراصل ستمبر ۱۸۹۱ء کا واقعہ ہے۔ جس کا تذکرہ آزاد کی اس رباعی میں موجود ہے۔

خورشید ہو ضوفشاں تو ذرہ پھر کیا   مہتاب میں جگنو کا چمکنا پھر کیا
جس بزم میں ہوں حالی وشبلی موجود   آزاد! اس بزم میں کہے گا پھر کیا

اور یہی وہ زمانہ تھا جب فضل حق آزاد قومی تحریکوں میں جناب قاضی سید رضا حسین کی وساطت سے حصہ لینے لگے اور ملکی سطح پر اپنی شخصیت کے اثرات مرتسم کرنے لگے۔ لیکن دینی علوم میں بھی اپنی شناخت قائم کرنے کو کوشاں رہے۔ یہی وجہ رہی کہ جب آزاد کے والد اور قاضی رضا حسین حج وزیارت کے فرائض ادا کرنے کے لیے عازم سفر ہوئے تو آزاد بھی ساتھ گئے اور فراغتِ مناسک حج کے بعد آزاد کے والد نے یہ خواہش ظاہر کی کہ آزاد کو حرم کی امامت میسر آئے۔ چنانچہ ان کے والد اور قاضی صاحب نے وہاں کے معلم سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ جب تک امام حرم سے باضابطہ قرأت کی سند نہ لے لی جائے کسی ہندی کی امامت پر اہل عرب راضی نہ ہوں گے اور اس سند کے حاصل کرنے میں خاصا وقت صرف ہوگا۔ چنانچہ قاضی صاحب مناسک حج سے فراغت کے بعد وطن لوٹ آئے پر فدا حسین اپنے لخت جگر کے ساتھ وہیں رُک گئے اور امام حرم سے قرأت کی سند حاصل کر کے حرم کی امامت کا شرف حاصل کرنے کے بعد ہی واپس ہوئے۔ اس ایک سال میں آزاد کی عربی دانی خوب پروان چڑھی اور بلا تکلف حجازیوں کی طرح کلام کرنے لگے۔

حجاز سے واپسی کے بعد سید فضل حق آزاد، شیخ نثار حسین رئیس لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی مشہور بہ شیخ کنواں کی صاحبزادی کے ساتھ رشتہ مناکحت میں منسلک ہو گئے۔ بقول محمد ابراہیم آہ چھپروی:

''حجاز سے واپس آنے کے بعد علامہ (فضل حق آزاد) کے والد بزرگوار نے موصوف کی تقریب شادی کی طرف توجہ کی اور علامہ شیخ نثار حسین صاحب رئیس

۱ مشمولہ ''مطالعہ آزاد، مرتبہ محمد ذکی الحق، بزم اردو، بی۔ این۔ کالج، پٹنہ، ۱۹۶۱ء، ص ۳۱۶

اعظم لودی کٹرہ کی صاحبزادی سے بیاہ دیئے گئے۔ وہاں سے علامہ کو بہت بڑی جائداد ملی جو تقریباً پچاس ہزار سالانہ کی آمدنی سے کم نہ تھی۔''[1]

اسی دوران جناب آزاد کے والد کا انتقال ہو گیا تو اچانک ان پر ذمہ داریوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کیونکہ والد کے انتقال کے بعد ان پر چھوٹی بہن کی شادی اور شاہو بگہہ اسٹیٹ پر بہت بڑے قرض کی ادائیگی کا مسئلہ تھا۔ خیر کہ اپنی علمی صلاحیتوں اور تعلقات کی بنا پر انہوں نے پہلے اپنے اسٹیٹ کو قرض سے آزاد کرایا پھر بہن کی شادی جسٹس شرف الدین ساکن نیورہ، پٹنہ سے کرنے کے بعد شاہو بگہہ کی زمین تمام بھائی بہنوں میں تقسیم کر دی اور خود محلّہ پیر بہوڑ میں داتا پیر بہوڑ شاہ کے مزار کے ٹھیک سامنے سڑک کی دوسری جانب ایک کوٹھی بنوا کر سکونت اختیار کر لی۔ تا کہ اسلامی طرز تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم سے بھی سنورنے کا موقع میسر کرائیں۔ سید فضل حق آزاد کو چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ بڑے لڑکے نورالحق نے انگلینڈ سے بیرسٹری کی تھی جبکہ دوسرے شمس الحق بیرسٹری پاس کر انگلینڈ ہی کے ہو رہے۔ تیسرے عبدالحق ترکی فوج کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور چوتھے عزیز الحق کو فضل حق آزاد نے خود تعلیم و تربیت سے آراستہ کرا اپنی ادبی وراثت سپرد کی تھی۔

سید فضل حق آزاد کو جہاں تک میں جان سکا اس سے اس نتیجے پر پہنچا کہ جناب آزاد غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے حامل قلم کار و فنکار تھے۔ اردو شعر و ادب کی مختلف اصناف پر ان کی یکساں دست رس حیرت انگیز رہی ہے کہ انہوں نے غزلیں کہیں تو نظمیں بھی خوب کہیں۔ قصیدے لکھے تو شخصی مرثیے کا پاس بھی رکھا اور رباعی نگاری کے میدان کو بھی وسعت عطا کی۔ اپنے ادبی مسلک و فلسفہ کے بیان کے لیے ادبی مضامین بھی خوب لکھے۔ سر سید احمد خاں کی تحریک میں شامل ہوئے تو یہاں بھی اپنی شخصیت کے نقوش مرتب کر گئے بقول پروفیسر محمد ذکی الحق:

> ''اردو ادب کی اصلاحی تحریک جس میں پرواز غزل سے نفرت اور انجمن مناظمہ کے قیام کی تحریک بھی شامل ہے۔ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے ہاتھوں ۱۸۷۴ء میں پہلے لاہور سے شروع ہوئی پھر حالی کے ساتھ دہلی آئی، سر سید احمد خاں کی روشن خیالی اور ادب کو افادیت سے قریب کرنے کی سعی نے اس تحریک کو

۱؎ مطالعہ آزاد، مرتبہ محمد ذکی الحق، بزم اردو، بی۔ این۔ کالج، پٹنہ، ۱۹۶۱ء، ص ۱۱-۱۲

> خوب پروان چڑھایا۔ اکثر حلقوں میں اس تحریک کی مخالفت بھی ہوئی۔ حالی کا منہ بھی چڑھایا گیا اور انہیں ''ڈفالی'' تک کہا گیا۔ بہار کا مردم خیز خطہ بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، بہار کی دنیائے شاعری میں حضرت آزاد صف اوّل کے شاعر تھے۔ جنہوں نے سر سید کی اصلاحی تحریک کو لبیک کہا اور اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ حضرت آزاد صرف شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک نہ تھے بلکہ بیداری ذہن اور روشن خیالی بھی ان کے حصہ میں آئی تھی۔ وہ صرف فکر سخن میں محو نہیں رہے بلکہ کبھی تو وہ سر سید کے ساتھ علی گڑھ مشن میں حیدر آباد، دکن گئے۔ کبھی ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں میں آزاد طلب کئے جاتے اور مجمع ان کی قومی نظموں سے محظوظ ہوتا۔ آزاد کو اپنے عہد کی قومی تحریکات سے گہری دلچسپی تھی۔ ہندوستانی قوم کی بدحالی انہیں برابر ستاتی رہی۔''[1]

یہ سچ ہے کہ فضل حق آزاد کا کوئی شعری مجموعہ یا مجموعہ مضامین اب تک شائع نہ ہو سکا سوائے ''رخت وصال'' کے جو سید شاہ اکبر داناپوری کے وصال ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء کا مرتبہ ہے اور اسی سال شائع ہوا۔ جبکہ پروفیسر سید حسن کا بیان ہے کہ:

> ''شمس العلماء محمد حسین آزاد ہوں، مولانا ابوالکلام آزاد ہوں یا حافظ فضل حق آزاد تینوں نوابغ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک ایسے مثلث کے تین تابناک نقطۂ ہائے راس ہیں جنہوں نے علم و دانش، ادب و انشاء، شعر و سخن اور تنقید و تحقیق کا بہت سا میدان احاطہ کر رکھا ہے لیکن ان تینوں ہم تخلص شخصیتوں میں جو شہرت اور مقبولیت اوّل الذکر دو کو نصیب ہوئی وہ حافظ آزاد کو نہ مل سکی اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی تصانیف منظر عام پر نہیں رہی ہیں۔''[2]

دراصل سید فضل حق آزاد کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ ان کے کلام میں صنائع الفاظ کا خوبصورت استعمال ان کے قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا تھا اس پر انداز بیان یا خوش گلوئی ان کے کلام کو دو چند بنا دینے کے لیے کافی تھا۔ اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر یکساں دست رس بھی ان کے اُسلوب کو

۱؎ ''مطالعہ آزاد، مرتبہ محمد ذکی الحق، بزم اردو، بی۔ این۔ کالج، پٹنہ، ۱۹۶۱ء، ص ۹۱

نکھارنے میں اہم رول ادا کرتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے کلام میں یا نثری تحریروں میں عربی و فارسی تراکیب کے بکثرت استعمال ہی کی بنا پر پروفیسر سید حسن نے جناب فضل حق آزاد کو محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ملا کر تثلیث بنانے کی کوشش کی ہے میں اسے ادبی دیانتداری تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ ان میں خاصا باہمی فرق ہے اور ان تینوں کو تخلیق کاری کے لیے الگ الگ ماحول ملا۔ یوں فضل حق آزاد کو قدرت نے خوبروئی، خوش خلقی اور خوش مزاجی بھی خوب عطا کی تھی اور جناب آزاد خوش لباس، خوش اطوار اور خوش گفتار بھی واقع ہوئے تھے۔ ان کی تحریروں میں بھی ان کی شخصیت کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ وہ زود فہم، پُرگو اور زود نویس بھی تھے، لیکن اس سے بھی تثلیث کا حق ادا نہیں ہوتا۔ جناب فضل حق آزاد کے اندر قومی جذبہ بھی تھا اور اپنے خیالات و نظریات کے بیان میں انہوں نے ہر چند کہ غزل، نظم، مرثیہ، قطعہ، قصیدہ اور رباعی نگاری کے علاوہ نثری تحریروں میں مقالات کا سہارا لیا۔ لیکن جب اس سے بھی ان کی تشنگی باقی رہ گئی تو انہوں نے ۱۵ر ستمبر ۱۹۰۲ء کو پندرہ روزہ اخبار ''تاج'' پٹنہ سے جاری کیا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ ''تاج'' نام سے ایک ماہنامہ رسالہ جگیشر پرشاد خلش نے بھی ۱۹۱۸ء میں گیا سے جاری کیا تھا۔ سید بدرالدین احمد نے اپنی تصنیف ''حقیقت بھی کہانی بھی'' میں فضل حق آزاد کے اخبار ''تاج'' کو ماہنامہ لکھا ہے اور تصدیق کی ہے کہ یہ کئی سال چلا اور ملک بھر میں مقبول ہوا۔[1] جبکہ ڈاکٹر سید احمد قادری نے اپنی تصنیف ''اردو صحافت بہار میں'' میں اسے ہفت روزہ لکھا ہے۔

اخبار ''تاج'' کے متعلق الحاج پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل کا بیان ہے کہ ''اس[2] اخبار کے مالک بھی اور ایڈیٹر بھی فضل حق آزاد تھے اور مقاصد اخبار تھے ''تہذیب، اصلاح حال، حمایت حقوق، اعانت اہل جوہر اور متقدمین شعرائے بہار کے کلام کو زندہ کرنا'' جب اس مقبول روزگار علمی اخبار کی پہلی جلد پوری ہوگئی تو آہ صاحب نے آزاد صاحب کو لکھا کہ:

''اب تک ''تاج'' میں کوئی بُرے مضمون شائع نہیں ہوئے، جن ہاتھوں ''تاج'' کے مقاصد کا موتی ٹوٹ جاتا، جو تحریر کا موتی ٹانکا گیا ہے۔ اگر انمول نہیں تو قیمتی ضرور ہے اور اگر نایاب نہیں تو کمیاب بے شک ہے۔''

اس کے بعد جلد نمبر (۱) کے مندرجہ ذیل مضامین و مقالات کی اپنے خاص انداز میں بہت تعریف کی ہے:

۱؎ حقیقت بھی کہانی بھی، ص ۵۴۶ ۲؎ مطالعۂ آزاد، ص ۴۰۔۴۱

''قوتِ بیانیہ، تاثیر خیال، دل دماغ، مسلمانانِ ہند اور تعلیم، تصنیف و ایجاد، بخل و اسراف، حرفے کی ترقی اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ: آپ کا ہر مضمون لاجواب ہے۔ بس لاجواب۔ لطفِ کلام کے کیا کہنے بس فوٹو کھینچا گیا ہے۔ ہائے میرؔ فدایت شوم۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا

آہؔ نے، رمضان شریف پر جو نظم اسی جلد کے کسی نمبر میں شائع ہوئی تھی، داد دے کر پڑھی اور پڑھ کر آزاد کو لکھ بھیجا۔

''آیا رمضان آئے نمازی رمضان کے''
کیا نظم ہے واہ واہ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آمین۔''

اخبار ''تاج'' کہنے کو اخبار تھا۔ اس لئے کہ اس میں آج کل کی بہ نسبت خبریں بہت کم اور علمی اور ادبی مقالات بہت زیادہ ہوتے۔ اس اخبار میں آج سے پچاس برس پہلے جو مقالات اور مضامین لکھے گئے ہیں اب ان کی افادیت اور دلکشی جوں کی توں باقی ہے۔ اس علمی اخبار میں اب بھی ایسے عنوانوں پر آپ کو مقالے ملیں گے اور نظمیں نظر آئیں گی جن کی نظیر اس دورِ بسیار نویسی میں بھی نہ ملے۔ اگر ان مقالوں اور نظموں کو اکٹھا کیا جائے تو اصلاحی، اخلاقی، تاریخی، معاشی اور معاشرتی نظموں اور مقالوں کی کئی ضخیم کتابیں تیار ہو جاسکتی ہیں۔''[1]

فضل حق آزاد کی زندگی میں دوسرا خلاء ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوا جب ان کی معنوی نصف (اہلیہ) جو بہت نیک سیرت اور دُکھ سُکھ میں معاون اور خدمت گزار واقع ہوئی تھیں داغ مفارقت دے گئیں۔ اس وقت ان کے چھوٹے صاحبزادے عزیز الحق کی عمر صرف ڈیڑھ سال کی تھی۔ چنانچہ چند برسوں بعد آزاد نے اپنے ہی علاقہ کی مشہور بستی سائیں رہلا کے ایک معزز غریب گھرانے کی لڑکی عمدۃ النساء سے دوسری شادی کر لی جو فضل حق آزاد سے عمر میں کافی چھوٹی تھیں۔ محل ثانی سے انہیں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ۱۹۱۲ء کے آس

۱؎ مطالعہ آزاد، ص ۴۰۔۴۱

پاس پیر بہوڑ، پٹنہ میں جو کوٹھی انہوں نے بنوائی تھی اسے جب سرکار نے ان سے خرید لیا تو انہیں واپس شاہو بگہہ جانا پڑا اس بابت آزاد کا بیان ہے کہ:

''۴۵ ہزار میں مکان بنایا، گورنمنٹ نے ۳۲ ہزار بمعذرت قیمت ادا کر کے حاصل کر لیا اور توڑ پھوڑ کر میدان کر دیا۔''[۱]

اس وقت تک ان کے وطن شاہو بگہہ میں تین کوٹھیاں موجود تھیں۔ چنانچہ اپنے مزاج کے مطابق تھوڑی تبدیلی کر کے وہیں منتقل ہوگئے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی صحت میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ ہر چند کہ شاہو بگہہ میں بھی شعر وسخن کی محفلیں سجنے لگیں تھیں لیکن۔ پہلے گراں گوشی کے شکار ہوئے، پھر بینائی جاتی رہی۔ بالآخر ۲۷ رشعبان ۱۳۶۱ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۲ء میں محبوب حقیقی سے جا ملے اور اپنے مسجد خانہ کے بیرونی صحن میں اپنے والد خلد آشیاں کے پہلو میں ہم آغوش لحد ہوئے۔

آزاد کی وفات کے بعد ادبی حلقہ جس قدر سوگوار ہوا اس کا بیان مختلف لوگوں کے یہاں میسر ہے۔ میں یہاں صرف جناب حمید عظیم آبادی تلمیذ شاد عظیم آبادی کا تاریخی قطعہ ارسال کر رہا ہوں۔

اُٹھ گیا دنیا سے وہ استاد فن فخر بہار — جس کے دم سے تھی گلستاں میں بہار شاعری
نام نامی فضل حق تھا کہتے تھے آزاد سب — ذی کمالی کا مرقع اب وہی اک ذات تھی
لطف کیا شعر وسخن کا جب نہیں جوہر شناس — اے حمید نوحہ خواں ایسی بھی کیا ہو زندگی
مصرعہ تاریخ رحلت تم نے سچ لکھاّ حمید — مسند جشنِ سخن افسوس سونی ہو گئی

(ندیم، گیا، جنوری ۱۹۴۲ء)

سید فضل حق آزاد کی شخصیت کے کئی رنگ تھے۔ قبل عرض کیا جا چکا کہ وہ بلا کے ذہین، علم پرور، علم دوست، بہترین شاعر، جس نے غزل، نظم، رباعی، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور مستزاد پر نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ اپنے عہد کے معتبر شعراء میں شمار کیے جاتے تھے۔ نثر کے میدان میں ادبی وقار کے لیے ادبی، سیاسی اور مذہبی مضامین بھی خوب خوب لکھتے تھے ان کی تخلیقات منظوم ومنثور عہد متعلقہ کے تمام معیاری اخبارات ورسائل مثلاً الپنچ، رسالہ زمانہ، ادب لطیف، مخزن، معارف، الجمال، تنویر مشرق، نیرنگ خیال، ادیب، دکن ریویو، زمیندار (لاہور)، حمایت اسلام (لاہور)، میں کثرت سے شائع ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے اندر زیادہ

۱ خود نوشت سوانح عمری، عید نمبر، صدائے عام، پٹنہ، ۱۹۵۰ء، ص ۸۳

خودنمائی نہ تھی۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ رسالۂ زمانہ، کانپور کے مدیر دیا نرائن نگم نے بذریعہ خط فضل حق آزاد سے ایک تخلیق مع تصویر طلب کی تو آزاد نے ایک منظوم Potrait بھیج دیا۔ ملاحظہ ہو وہ پوٹریٹ، بعنوان ''بتکدۂ آزاد'' :

ہوا ہوں پیر، نالاں ہیں جوان و پیر بھی مجھ سے — نہیں ممکن کوئی تقریر یا تحریر بھی مجھ سے
خفا ہے نظم عالمگیر کی تاثیر بھی مجھ سے — نگم صاحب نے مانگی ہے مری تصویر بھی مجھ سے
مگر حیرت یہ ہے تصویر میں بھیجوں تو کیا بھیجوں

بڑھاپے نے مری تصویر اس سانچے میں ڈھالی ہے — سراپا حسن وشوخی کی اداؤں سے جو خالی ہے
نہ صحت ہے نہ شادابی نہ چہرے پر بحالی ہے — بس اک پیکر جو فانی اور صرفِ پائمالی ہے
اک ایسی بدنما تصویر میں بھیجوں تو کیا بھیجوں

جوانی کی کوئی تصویر ہوتی بھی تو کیا ہوتی — بڑھاپے میں وہ دلکش بھی نہ ہرگز دلربا ہوتی
پرستش میں نہ کرتا آہ، گر اس کو بقا ہوتی — بقا بھی چار دن کی چاندنی تھی پھر فنا ہوتی
تو پھر کس منہ سے یہ آئینہ عبرت نما بھیجوں

جوانوں کی اُمنگیں ہیں نہ دلگیری ہے پیروں کی — فقیروں کی سی صورت ہے وجاہت ہے امیروں کی
خموشی عارفانہ ہے، فغاں قدسی صفیروں کی — جو آزادوں کی آزادی تو پابندی اسیروں کی
جو عالم ہے جدا ہے شکل ہر عالم جدا بھیجوں

مصور دنگ ہے، بیتاب ہے ہم رنگ پروانہ — ہوا جاتا ہے لبریز اس کی صناعی کا پیمانہ
کھنچیں گی تا کجا تصویر ہر عالم جداگانہ — مگر اک حضرت آزاد کا ہوگا وہ بت خانہ
مسلماں ہوکے یہ بتخانہ اے مردِ خدا بھیجوں

یہاں فضل حق آزاد کی خلاقی معنی دیکھتے بنتی ہے کہ تصویر کا Potrait بھی ہے اور تخلیق بھی۔ لیکن آخری مصرع غور طلب ہے کہ ''مسلماں ہوکے یہ بتخانہ اے مردِ خدا بھیجوں'' اور جناب متین عمادی کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

''ان (آزاد) کی ادبی سرگرمیاں جہاں ان کو ایک طرف اعلیٰ معیار وادب کی تخت

۱ فضل حق آزاد، متین عمادی، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ، ۲۰۰۶ء، ص ۹

نشینی بخشے ہوئے تھی وہیں ان کی عیش پرستی بھی ان کے پہلو بہ پہلو تھی۔اس دور کے رئیسوں کا جو رنگین مزاج تھا اور جن دلچسپیوں کے وہ دلدادہ تھے، وہ ساری دلچسپیاں آزاد میں پائی جاتی تھیں۔دولت جو بے جا آسائش فراہم کرتی ہے اس کا پورا لطف آزاد نے اٹھایا تھا ان کے بنگلے میں ادبی محفلیں بھی جم رہی تھیں۔لکھنؤ اور دہلی سے طوائفیں بھی بلائی جارہی تھی۔ناؤ نوش کا انتظام بھی تھا۔رئیس کاستھوں کی ناچ اور رنگ کی محفلوں میں شرکت ہورہی تھی۔ان ہی رنگین محفلوں کی یادگار ان کی نظم ''ہولی'' ہے۔غرض آزاد نے زندگی کے ہر رنگ کو اپنے اوپر ڈھال رکھا تھا۔''[1]

فضل حق آزاد کا بیان ہے کہ شاعری میں انہوں نے کسی سے شرف تلمذ حاصل نہیں کیا اور نہ ہی وہ اس فن میں کسی کے استاد رہے:

آزاد ہوں ہے طبع بھی اپنی آزاد — میں کیا جو رکھوں نظم سخن کی بنیاد
اس فن سے مناسبت فقط ہے ورنہ — شاگرد کسی کا نہ کسی کا استاد

اور پروفیسر عبدالمنان بیدل کا بیان ہے کہ:

''کسی نے کسی اخبار میں کہیں یہ لکھ دیا کہ حضرت آزاد غالباً شوق نیموی سے مشورۂ سخن کرتے ہیں غیور و غیرت مند آزاد اس الزام بیجا کو کب گوارا کرسکتے تھے برجستہ جواب میں جو کچھ لکھا اس نظم کے صرف چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ہوں مجتہد العصر اگر اس کو نہ مانو — اتنا تو کہوں گا کہ مقلد نہیں واللہ
اک ربط طبیعی ہے مجھے نظم سخن سے — بازار یہ میرا کبھی کاسد نہیں واللہ
رہرو بھی میں وہ ہوں، مری رفتار کو ہرگز — درکار کوئی رہبر و مرشد نہیں واللہ''[2]

پروفیسر عبدالمنان بیدل کا بیان ہے'' آزاد ایک ایک طرح میں دوغزلہ، سہ غزلہ، بلکہ چہار غزلہ لکھ گئے۔''

قصہ مختصر یہ کہ حافظ سید فضل حق کی شخصیت وسیرت میں بے پناہ وسعت وعلمیت تھی اور انہوں نے کم وبیش چھ دہائیوں تک شعر وادب کی محفلوں کی آبیاری کی۔

آزاد کی غزل گوئی

غزل ہر چند کہ کوئی دو صدی سے معتوب ومقہور ہوتی چلی آرہی ہے، تاہم اس کی شہرت ومقبولیت اور حسن واثر میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔یہ زرنگاروں کی محبوب تو دل فگاروں کی جاں ہے۔اس کافر نے کتنوں کے ایمان پر شب خون مارا اور کتنوں کو گھائل کیا۔تبھی تو کسی نے ''غزل کی گردن بے تکلف ماردینے کا فتویٰ صادر کیا'' تو کسی نے اسے ''نیم وحشی صنف سخن قرار دیا'' ہر چند کہ کہنے والے نے اسے اردو شاعری کی آبرو بھی قرار دیا۔ان سب کے باوجود اس کے حسن جادو نگار کا وار سہنے والے سب کچھ سہ گئے۔اس کی عشوہ طرازیوں اور کرشمہ سازیوں نے کیا کیا قیامتیں ڈھائیں اس کا کوئی شمار کسی محقق کے پاس آج تک نہیں۔اس کے حسن وجمال اور کیف واثر کے رموز واسرار آج بھی بہت حد تک دانشوران عصر کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔اس کی مایہ داری کا مول چکانا کسی سہل پسند ناقد کے بس کا روگ نہیں۔اگر اس کے سرّ نہاں کا احساس کسی حد تک ہوسکتا ہے تو اسی کو جو خود شاعر بھی ہو، نغمہ طراز بھی اور ساز دل نواز بھی ہو۔یا پھر اس کی طلسم آرائیوں اور معجز نمائیوں کا مارا ہوا باذوق قاری جو اس کی حشر سامانیوں سے براہ راست متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔تبھی تو انیس و دبیر جیسا مرثیہ نگار ہو کہ سودا وذوق جیسا قصیدہ گو، ہر کسی نے غزل کی شہرت ومقبولیت اور حسن واثر کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے یعنی اپنے شعری ذوق کی ابتداء غزل ہی سے کی ہے بلکہ اردو شعر وادب کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جو غزل گوئی سے دامن بچا کر دوسری صنفِ شاعری میں سیدھے داخل ہوا ہو۔فضل حق آزاد نے بھی بظاہر ایجاز واطناب کے فرق کی دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی بلکہ اپنی فکر کا سکّہ جمایا لیکن ابتداء ایجاز کی صنف، صنفِ غزل ہی سے کی۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر روحی حسن مجید کا بیان ہے کہ:

'' آزاد ان فنکاروں میں ہیں جن کا ذہنی ارتقا کسی گام پر نہیں رکتا۔آزاد نے اپنی

[1] فضل حق آزاد، عصر حیات اور فن کار، ڈاکٹر روحی حسن مجید، ۱۹۸۰ء، ص ۶۴
[2] حقیقت بھی کہانی بھی، ص ۵۵۲

غزل گوئی کی ابتداء جیسا کہ قیاس کیا جاتا ہے۔۱۸۷۰ء میں کی، مگر ان کا باضابطہ
کلام رسالوں میں ۱۸۸۵ء سے پہلے نہیں ملتا ہے۔''[۱]

ڈاکٹر روحی حسن مجید نے ان کی غزلیہ شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کر کے تجزیے کی کوشش کی ہے اور پہلے دور کی غزلوں میں وہی عیش کوشیاں، وہی لذتیں، وہی لگاوٹیں، بناوٹیں دریافت کی ہیں، جو کسی عیش پسند ماحول میں پلے بڑھے انسان کا خاصہ ہوتا ہے اور دوسرے دور میں قومی، اخلاقی، سیاسی اور اصلاحی خیالات کی دریافت کی ہے، جبکہ تیسرے دور میں جس رجحان ومیلان کی بات کرتی ہیں اسے سید بدرالدین احمد نے عمومی طور پر یوں سمجھا کیا ہے کہ:

''ان (غزل) جواہر پاروں میں کہیں آپ کو غالب کے افکار کی چمک نظر آئے گی، کہیں آتش کی آزاد منشی کی صوفیانہ جھلک دکھائی دے گی اور کہیں مومن خاں کی مُعاملہ بندی کا رنگ نظر کے سامنے گھوم جائے گا۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی اپنی انفرادیت ہر جگہ صاف نمایاں ہوگی۔''[۲]

لیکن سرمایہ آزاد میں فکریات کا جو عمل دخل ہے وہ کسی طور غالب سے نہیں ملتا۔ ہاں آزاد کے کلام کا محرک بنیادی طور پر رومانیت اور ضمناً عقلیت کی ترجمانی کا مرکب ہے اور اسی سبب سے ان کے کلام میں ایک تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن بغور مطالعہ کیا جائے تو اسی تشنگی نے تخلیقی سطح پر انہیں کئی صنفوں سے وابستہ کیا۔ آزاد نے غزلیں کہیں، نظمیں لکھیں، قصائد کہے، مراثی لکھے، رباعیات پر طبع آزمائی کی، دوسرے کے کلام پر تنقیدیں لکھیں۔ خود کا مجموعہ کلام شائع نہ کرایا کہ دوسرے کیا تبصرہ کر دیں۔ صحافت سے رشتہ جوڑا لیکن قرار واقعی کہیں بھی میسر نہ آیا کیوں کہ آزاد نے مختلف مذاہب ومسالک اور علوم وفنون کا مطالعہ ایسی عرق ریزی سے کیا تھا کہ حیات وکائنات کے بنیادی مسائل کی طرف زیادہ جھکاؤ رہا۔ پروفیسر وہاب اشرفی کا تجزیہ کسی حد تک مختصر ترین ہونے کے باوجود قابلِ قبول لگتا ہے کہ:

''مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان (آزاد) کی غزلیں زیادہ دلکش ہیں جن میں کلاسیکی رنگ بے حد نمایاں ہیں کہیں کہیں بے تکلفی کا ایسا انداز ہے جس کی مثال کم ملتی ہے۔ مثلاً:

پاس بیٹھے نہ کچھ کہا نہ سنا   ایسا دیکھا تو ہائے کیا دیکھا
بانکپن میں، ادا میں، شوخی میں   ہم نے ایسا نہ دوسرا دیکھا''[۱]

۱۔ تاریخ ادب اردو، جلد اوّل، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۳۹۷
۲۔ سراج ومنہاج، پروفیسر اختر اورینوی، ایوان اردو، پٹنہ، ۱۹۶۴ء، ص ۳۰۸

کیونکہ کلاسیک اسی وقت ظہور میں آتی ہے، جب کوئی تہذیب کامل ہوتی ہے۔ جب اس کا زبان وادب کامل ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ کسی کامل دماغ کی تخلیق ہوتی ہے۔ آزاد علمی وادبی شعور کی حد تک کامل دماغ رکھتے تھے اور اپنی قوم کی ساری صلاحیتیں سارے جواہر سے آشنا تھے۔ ساتھ ہی زبان وبیان پر انہیں اس قدر قدرت حاصل تھی کہ ہم ان کے فن کو کلاسیک کی جملہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ لفظ جامعیت کے اضافے کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ پروفیسر اختر اورینوی فرماتے ہیں کہ :

''میرا خیال یہ ہے کہ شعرائے متاخرین میں پانچ بڑی شخصیتیں گزری ہیں۔ شاد، آزاد، صفیر، شوق، اثر اور ان میں بھی شاد وآزاد کا مقام بہت بلند ہے۔ آزاد کی شہرت اپنے زمانے میں تو بہت تھی، لیکن اس کے بعد ان کا نام ماند پڑتا گیا۔''[۲]

غور طلب ہے کہ شاد عظیم آبادی، شوق نیموی اور فضل حق آزاد تینوں کا شعر وادب میں اپنا ایک مقام تھا اور اپنی تہذیبی وراثت کو خاطر میں لاتے ہوئے اخلاقی طور پر رواداری کے پاسدار تھے۔ لیکن ان تینوں کے ادبی معرکہ کی بھی ایک ادبی حیثیت ہے جس پر گفتگو آئندہ ابواب میں ہوگی۔ یہاں صرف ایک جھلک ملاحظہ ہو۔ پہلے شاد کی ایک مشہور مرصع غزل کے چند اشعار :

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم   تعبیر ہے جسکی حسرت وغم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
میں حیرت وحسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر   دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
اب درد جدائی سے ان کی اے آہ بہت بیتاب ہیں ہم   ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں، پاس اپنے بلالیں بہتر ہے

آزاد نے شاد کی اسی زمین میں معرفت الٰہی میں ڈوبی ہوئی ایک غزل پیش کر دی، جس میں ان کے متصوفانہ میلان کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے:

اس دام گہہ خشک وتر میں دریا بھی ہمیں ساحل بھی ہمیں   پایاب کہو پایاب ہیں ہم غرقاب کہو غرقاب ہیں ہم
عالم کو خدائے عالم نے وابستۂ صد اسباب کیا   عالم ہے جو اپنا کیا کہیے ایک عالم بے اسباب ہیں ہم
صرصر کی طرح ٹھہرے نہ کہیں ہم ہیں وہ مسافر بستی کے   از صبح ازل تا شام ابد ہر ساعت با پہ رکاب ہیں ہم
آنکھیں جو کھلیں تو کیا دیکھا مسجود جو تھا خود ساجد تھا   جو خواب نہ دیکھا یوسف نے اللہ وغنی وہ خواب ہیں ہم
گستاخ کرم معراج صفت گو بندۂ بے آداب ہیں ہم   کھوئے سے گئے پاتے ہی تجھے تو جب سے ملا نایاب ہیں ہم

علامہ فضل حق آزاد نے غزل کے میدان میں نت نئے تجربے کیے ہیں۔ جس سے قاری کو بہ آسانی یہ نتیجہ میسر آ جائے گا کہ آزاد نے جن زبانوں پر قدرت حاصل کر لی تھی اس کے برمحل استعمال

میں کس قدر روانی تھی، کیسا کلاسیکی حسن تھا، کیسا توازن تھا، فصاحت ومحاورہ کی درستگی کے ساتھ زبان کی صحت کا کیسا تحلیلی تجربہ تھا۔ تو آیئے چند غزلیں بطور نمونہ پیش کیے دیتا ہوں:

غزل

دل سے بہتر نہ آئینہ دیکھا — دل کے آئینے میں خدا دیکھا

رند دیکھا نہ پارسا دیکھا — ایک عالم کو مبتلا دیکھا

حسن دیکھے ہیں ناز دیکھے ہیں — کچھ نہ پوچھو کہ آج کیا دیکھا

لب و دندان کو چشم وابرو کو — ہم نے سب کو جدا جدا دیکھا

بانکپن میں ادا میں شوخی میں — ہم نے ایسا نہ دوسرا دیکھا

ہر ادا میں اوس آفتِ جاں کی — ایک فتنہ چھپا ہوا دیکھا

حور کا حُسن حضرت واعظ — یہ تو کہئے سنا ہے یا دیکھا

نقل ہے ایک اس کے کوچے کی — باغِ فردوس ہم نے جا دیکھا

آنکھ میں خاک ڈال کر دل کو — بھری محفل سے لے گیا دیکھا

اُس کی محفل میں کی نگاہ جدھر — ایک کو دشمن ایک کا دیکھا

پتلیاں پھر گئیں تو بول اٹھے — آخر آنکھیں چُرا گیا دیکھا

پاس بیٹھے نہ کچھ کہا نہ سنا — ایسا دیکھا تو ہائے کیا دیکھا

دیکھنے والے کم نکلتے ہیں — یوں تو آنکھوں کا دیکھنا دیکھا

حال آزاؔد کا نہ پوچھو آہ
ایک مُردہ پڑا ہوا دیکھا

غزل

دل کا آنا دل کو ایسا بھا گیا — جب حسیں دیکھا کوئی دل آ گیا

دل گیا یا رہ گیا کیا کام ہے — اس میں بارے ناصحوں کا کیا گیا

اُس کے آگے بڑ گئی پھولوں پر اوس — چاند بھی منہ دیکھ کر شرما گیا

---

[۱] دکن ریویو، شمارہ ۹، جلد ۲، ص ۵۲

پھول جب دیکھا کوئی ہنستا ہوا — گریہ شبنم مجھے یاد آ گیا

دیکھنے آیا طبیب آزاؔد کو
گھر سے ہنستا آیا تھا روتا گیا

غزل

چمن ہوگا گُل افشاں ساقیٔ گلفام آئے گا — الٰہی دور میں کب میکشوں کا جام آئے گا

دمِ تلقین نہ جب وہ دلبرِ خود کام آئے گا — تو اے دل پھر مرا مرنا مرے کس کام آئے گا

چھڑے گی بحث حسن وعشق پیشِ داورِ محشر — سر دفتر ہمارا یا تمہارا نام آئے گا

دھوئیں پر ٹالتا ہے واہ متوالی گھٹاؤں کو — ترے فقروں میں ساقی رندِ مے آشام آئے گا

کہاں رندانِ میکش حضرت واعظ کہاں توبہ — بھلا یہ پختہ مغزاں کو خیالِ خام آئے گا

خراباتِ مغاں کی خاک ہے اکسیر کی چٹکی — محک پر میکشوں کا کفر بھی اسلام آئے گا

اگر میری وفاؤں کا یقیں تم کو نہیں آتا — نہ آئے خود تمہارے حسن پر الزام آئے گا

وہ تھی اک ہمدموں کی لگی اب ہم سمجھتے ہیں — کہ قاصد آئے گا خط آئے گا پیغام آئے گا

خبر کیا تھی ادھر اچھی طرح پر بھی نہ نکلیں گے — اُدھر اے باغباں صیاد لے کر دام آئے گا

عطائے حضرت پیرمغاں ہے جھک کے لے زاہد — تامل میں یہاں الزام پر الزام آئے گا

قیامت ہے کہ وہ آکے تربت پر یہ کہتے ہیں — بہت بیچین تھے اب آپ کو آرام آئے گا

یہاں آغاز ہی میں بے خبر ہیں دونوں عالم سے — نہ پوچھو مدعا کب بر سرِ انجام آئے گا

تمھیں آزاؔد ہو بس پہلوانِ شاعری باقی
نہ رستم آئے گا ہرگز نہ زال و سام آئے گا

غزل

شبِ نشاط ہے ساقی قرابۂ مئے لا — چراغ آنکھوں میں روشن ہوں جس سے وہ شئے لا

پری اوتار دے شیشے میں خم کو خالی کر — کھلا دے پھول وہ بھر کر گلاب یاں مئے لا

گرانہ برق غضب اپنے بادہ خواروں پر — کہ رند قیس ہیں آج اور بوتلیں لیلے

زمانہ محوِ طرب ہے وہ امن ہر سو ہے — یہ انسداد کہ فریاد ہے نہ واویلا

آزاد بحیثیت نظم نگار

غزل کے علاوہ ہماری شاعری کی تمام ترہیئتیں عمومی طور پر نظم کہی جاتی رہی ہیں۔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ہجو، واسوخت کے ساتھ مسدس، مخمس، مربع، مثلث، ترجیع بند، قطعات، رباعی، مستزاد اوران پابندیوں سے آزاد شاعری کے تمام اسالیب کو نظم ہی کہا گیا ہے اوراسے انگریزی لفظ Verse کا مترادف کہا گیا ہے۔ میکانکی تبدیلیوں یا ادبی وسعتوں نے بعد کوانہیں الگ ساختیاتی صنفی حیثیت دے دی ہے۔

اردو میں نظم نگاری کا آغاز غزل ہی کی طرح فارسی روایت کے زیراثر اورغزل ہی کے پہلو بہ پہلو ہوا۔ نظم کی مختلف ہیئتیں بھی اردو کے شعری سرمائے میں داخل ہوئیں۔ جہاں تک مرثیہ کا تعلق ہے اس نے ہیئتی اعتبار سے ارتقاء کے کئی مراحل طے کیے۔ مسدس اس کے لیے موزوں اورمناسب فارم قرار پایا۔

جدید دور کی شعری روایت کی تشکیل حالی اورمولانا محمد حسین آزاد کی رہین منت ہے ۔قومی، وطنی اور سیاسی موضوعات نے اس عہد میں قبول عام حاصل کیا جس کی وجہ سے اردو شاعری کا جہانِ معنی بدل گیا۔ ترجیع بنداور ترکیب بند میں متذکرہ بالا موضوعات پر کئی شاہکار نظمیں منظرعام پر آئیں اوراس دور میں ہیئتی نقطۂ نظر سے دوطرح کے تجربات ہوئے ایک جومغرب سے مستعار ہیں دوسرے وہ جو بنگالی شاعری، لوک گیتوں اور ہندی کے زیراثر ہوئے جناب حافظ سید فضل حق آزاد کا زمانہ بھی یہی ہے اورانہوں نے بھی شاعری کے تمام اسالیب قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، مستزاد میں طبع آزمائی کی۔ پروفیسر اختر اورینوی کا بیان ہے کہ:

''اردو میں موضوعاتی نظموں کا رواج صحیح معنوں میں نظیرا کبرآبادی سے ہوا اور بعدازاں اسمٰعیل میرٹھی سے لے کر محمد حسین آزاد، حالی اورچکبست نے اس طرف توجہ کی۔ اقبال اور جوش نے اس میدان میں خوب خوب گُل کھلائے۔عصر حاضر میں موضوعاتی نظموں کو خاصہ فروغ ہوااوراس نوع کی فن کاری نے غزل کے سیل رواں کو تھام لیا ہے۔حضرت آزاد (فضل حق آزاد) نے بھی بہ کثرت موضوعاتی نظمیں لکھیں ہیں۔ان میں ہمیں منظر نگاری بھی ملتی ہے۔ سیرت نگاری اور مسائل حیات کی تشریحات بھی نظر آتی ہیں۔''[1]

اردو میں نظم نگاری کے بہ تدریج ارتقائی سفر پر پروفیسر اختر اورینوی کی نگاہ سخت ہے اور یہ سچ ہے کہ نظیر کے بعد محمد حسین آزاد، حالی، شبلی اوراسمٰعیل میرٹھی نے نہ صرف یہ کہ نظم نگاری کی ضرورت کو محسوس کیا بلکہ مغربی ادب سے استفادہ کرتے ہوئے اس کے لیے وسیع میدان کی تلاش وجستجو کی جس سے تحریک پا کر جہاں کئی لوگ اس صنف کی طرف بڑھے وہیں سرسید تحریک اور دبستانِ حالی وشبلی کے اثرات سے حافظ سید فضل حق آزاد نے بھی نظم نگاری کی طرف رُخ کیا۔ فضل حق آزاد کو چونکہ زبان وبیان، فن وتکنیک، تراکیب الفاظ اورتشبیہات واستعارات ضرب الامثال کے برمحل استعمال پراس قدر قدرت حاصل تھا کہ انہوں نے موضوعاتی نظموں کے میدان کونت نئی وسعت عطا کردی۔ اوراگران کی بکھری ہوئی نظموں کو سمیٹا جائے تو ان کی نظموں میں ہمیں طنزیہ اور مزاحیہ انداز بھی ملیں گے۔ دیکھئے عہد متعلقہ میں تعلیم کا جو معیار ہمارے معاشرے میں تھا یا اب ہے اس پر فضل حق آزاد نے کس طرح اپنے مقصد حیات کی توضیح کی ہے۔

اپنی دنیا میں تواہلِ علم کا یہ حال ہے — کاش ان کو کھیت دے کوئی تو ہے اس پر یقین
ان سے جوتی جائے گی ہرگز نہ بوئی جائے گی — بے تردد یوں ہی رہ جائے گی بنجر زمین
کاروباران سے کہاں ممکن کہ ہے اس میں حساب — اور یہ توحید کے بندے نہ دو جانیں نہ تین

[1] سراج ومنہاج، پروفیسر اختر اورینوی، ایوانِ ادب، پٹنہ ۱۹۶۴ء، ص ۳۲۵۔۳۲۶

علامہ جمیل مظہری (۱۹۰۴ء۔۱۹۸۰ء) کا شمار بھی صف اوّل کے جید شاعروں میں کیا جاتا ہے۔انہوں نے بھی آزاد کی طرح کئی اسالیب شاعری کو وسعت دی۔آزاد کے عہد میں عمر اور شعروادب کے تخلیقی شعور کے لیے سنِ شعور کو پہنچ گئے تھے۔چنانچہ آزاد شناسی کے لیے ان کی رائے بھی اہم ہے۔

''اردو نظم حالی سے چل کر اقبال تک پہنچنے سے پہلے فضل حق آزاد کی مہمان رہی اور ان ہی کی سرپرستی میں نشو ونما پائی۔آزاد اس کے سلسلۂ ارتقاء کی وہ درمیانی کڑی ہیں جسے ان کی گمنامی کے پیش نظر گمشدہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔''[1]

یہاں علامہ مظہری کو یہ شکایت ہے کہ فضل حق آزاد کے فن پر جس طرح لکھا جانا چاہیے تھا نہیں لکھا گیا۔اور یہ شکایت حق بہ جانب بھی ہے۔لیکن قاری یا تنقید نگار کی مشکل یہ رہی کہ ان کا کوئی تخلیقی کارنامہ مجموعہ کی شکل میں سامنے نہ آیا۔علامہ جمیل مظہری آزاد کے تخلیقی مسلک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں تک کہہ گئے کہ:

''آزاد کے دامن میں خدا کے فضل سے ایسی جنس تھی جس کا ماشاءاللہ آج بھی کوئی خریدار نہیں ہے۔آزاد قدرت کی طرف سے ایک آزاد ذہن لے کر آئے تھے۔اپنے مذہب میں راسخ العقیدہ ہونے کے باوجود ہر مذہبی مسئلے کو عقل کی ترازو پر تولنے کے عادی تھے۔ماحول انہیں اگر سازگار ملتا تو علامہ شبلی کی طرح وہ بھی ایک نئے علم کلام کی داغ بیل ڈال جاتے کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ ان کا ذہن مذہبی مسائل میں شبلی کے ذہن سے زیادہ صاف تھا۔شبلی سب کچھ ہونے کے باوجود مولوی تھے۔آزاد کچھ نہ سہی ایک شاعر رندمشرب ہونے کی حیثیت سے اپنے ذہن کی کھڑکیوں کے تمام تالے توڑ چکے تھے۔چنانچہ مصطفےٰ کمال پاشا نے جب ترکی سلطان سے قبائے خلافت اتروائی تو تمام اسلامی ہند نے ہائے خلافت اور وائے بے دینی کے نعرے لگائے اور

۱؎ مطالعۂ آزاد،ص۱۷۹

سوائے مولانا ابوالکلام آزاد اور سید فضل حق آزاد جیسے دو آزادوں کے کسی نے بھی ان کے موقف کو نہ سمجھا۔''[1]

حیات آزاد کے ذیل میں اس کی وضاحت کی جاچکی ہے کہ فضل حق آزاد کے یہاں معاشرے کے اصلاحی مقاصد کی گونج ملتی ہے اور اسی جذبے کے تحت انہوں نے سرسید، حالی اور شبلی کے ساتھ حیدرآباد کا سفر کیا تاکہ سرسید تحریک کے لیے پیسے جمع کیے جائیں۔انہوں نے اپنے اس جذبے کو یوں بیان کرنے کی کوشش بھی کی:

میری تعمیر ہستی سے فغاں میں   میں آوازِ جرسِ ہوس کارواں میں

گویا علامہ آزاد کی موضوعاتی نظموں میں رنگارنگی و بوقلمونی اور موضوعات کا تنوع بھی ہے۔ان کے یہاں تخیل وتجربے کی بھی فراوانی ہے اور تشبیہات واستعارات کے برمحل استعمال کا حسین پیرایہ بھی۔علامہ فضل حق آزاد کی موضوعی شاعری میں ہندی الفاظ کے بھی برمحل استعمال کا سلیقہ ملتا ہے تو ضرب الامثال کا استعمال بھی۔کہیں کہیں لَے اور سُر کا استعمال بھی اس طرح ہوا ہے کہ صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ آزاد موسیقی کا بھی علم رکھتے تھے جس کا سرجوش سب سے زیادہ ان کی طویل نظم ''ذرا اس کی ابتدا اور انتہا کو دیکھو'' میں نمایاں ہے۔یہ نظم کل ۱۹۲ اشعار پر مشتمل ہے جس میں آٹھ اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آزاد موسیقی کے علم سے بھی پوری طرح واقف تھے۔تو آیئے ان کی چند نظموں سے روبرو ہولیا جائے:

حقیقتِ حُسن

خدا نے حسن کو پیدا کیا جو روزِ ازل   تو بعد حمد وثنا حسن سے سوال کیا
نظر فریب بنا کر ریاضِ عالم میں   جو میری ہستی ناچیز کو نہال کیا
تو کس قصور میں یارب کیا زوال پذیر   دیا یہ اوج تو پھر کیوں نہ لازوال کیا
ملا جواب کہ ہے لازوال ذاتِ قدیم   یہ اس کی شان ہے تو نے یہ کیا خیال کیا
اسی زوال و تغیر سے ہے ترا نیرنگ   اسی زوال نے پیدا ترا کمال کیا

۱؎ مطالعۂ آزاد، ص۱۵۷۔۱۵۸

غور طلب امر یہ ہے کہ اسی عنوان سے اقبال کی بھی ایک نظم ہے کم وبیش انداز بھی وہی ہے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ آزاد و اقبال میں مستند کون کیوں کہ بنیادی فرق واضح ہے، یہ الگ بات ہے دونوں نے نظم نگاری کی طرف ایک ساتھ قدم بڑھایا تھا۔ سید علی حیدر نیّر کا یہ تجزیہ ملاحظہ ہو:

''آزاد اقبال سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ مشترک عنوانات پر نظمیں لکھتے ہیں وہی انداز بیان سامنے رکھتے ہیں۔ فلسفیانہ نکتہ رسی بھی کرنا چاہتے ہیں ۔گرچہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اقبال پیش پا افتادہ واقعات بھی پیش کرتے ہیں تو بات بات میں موشگافی کر جاتے ہیں اور فلسفہ حیات کی وہ نقاب کشائی کرتے ہیں جو دوسروں کے بس کی بات نہیں ہے۔ آزاد نے اقبال کے خیالات کو جہاں نئے انداز سے پیش کرنے کی سعی کی ہے وہاں بھی بے بس نظر آتے ہیں۔ جیسے ''حقیقت حسن والی نظم سے ظاہر ہے۔''[1]

حُسن سے متعلق آزاد کی یہ نظم بھی ملاحظہ ہو:

شکوۂ حُسن

کہا یہ حسنِ گراں سر نے چشمِ عاشق سے — کہ کیوں نہیں وہ نظر تیری آج جو کل تھی
اُدھر ہی کعبۂ مقصود تھا جدھر میں تھا — پلک جھپکنے سے معذور تھی معطل تھی
مری نظر سے پھرے اِس کا واہمہ بھی نہ تھا — کہ مستِ پائے بہ داماں کشیدہ تھی شل تھی
پیام شوق کا گویا بندھا ہوا تھا تار — شہیدِ تیغ ادا بے قرار بیکل تھی
اٹھا کے آئینہ دیکھا تو شانِ حسن اپنی — بحمدہٖ کہیں پہلے سے خوب و افضل تھی
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں وہی ہوں جو تھا — نہ تو ہی آج ہے اندھی نہ کل ہی احول تھی
کہا یہ چشم تمنا نے سن کے شکوۂ حسن — حضور میں تو ہمیشہ سے لغو و مہمل تھی
مگر حضور کی سج دھج کا واہ کیا کہنا — کہ آج تیغ ہے گر کل نکلتی کو پل تھی

---

[1] فضل حق آزاد بحیثیت نظم نگار، حلقۂ شعر و ادب، پٹنہ، ۱۹۶۴ء، ص ۲۵

نہ فرق اپنی نظر میں، نہ حسنِ صورت میں
جو ہے وہ بات یہ ہے وہ نگاہِ اوّل تھی

آزاد کی موضوعاتی نظموں کے تیور کو مزید دیکھنا ہو تو یہ نمونے ملاحظہ ہوں:

حُسن اور حُسنِ ادا

حُسنِ صورت نے سنی حُسن ادا کی تعریف — سنتے ہی دل کو لگی آگ۔ ہوا چیں بہ جبیں
منھ تو دیکھو نہ کمر ہے نہ دہن ناک نہ آنکھ — اور تعریف و ثنا فرش سے تا عرش بریں
کشورِ حسن میں ایک ایک ہے جو پست و بلند — مو بہ مو سب تو مرا اس کا تو اک تِل بھی نہیں
زشت رو کی ہیں ادائیں بھی سراسر بد و زشت — حسنِ صورت ہی کا صدقہ ہے ادائے شیریں

لب کھُلے حسنِ ادا کے جو سُنی یہ تقریر — حسنِ صورت کی یہ ہے میرے ہی دم سے تحسین
دیکھئے چاند کو منھ کیا ہے کہ چاندی کا طباق — بھولا پن اُس میں ذرا ہے نہ وقار و تمکیں
یوں تو ہیں قوسِ قزح کی بھی کمانیں مشہور — ابروؤں کا سادہ بَل اُس میں کہاں ہے بہ یقیں
نیم باز آنکھ جو نرگس کی مُعطّل ہے سو ہے — اُس میں شوخی کی ہے دز دیدہ نگاہی بھی کہیں
منھ نہ کھلوایئے میرا کہ اگر پوچھئے سچ — آسماں میں ہوں۔ اگر حسن کی حضرت ہیں زمیں
ساتھ ہی حُسن کے ہے حُسنِ ادا جلوہ — آپ کو صدر سمجھئے نہ مجھی کو پائیں

جس طرح آپ کی صورت سے ہے مجلو رونق
میں بھی آٹے میں۔ نمک ہوں یہ رہے ذہن نشیں

حُسنِ صورت کا انجام

اِک جواں اِک شیخِ فانی سے ہوا ہمکلام — اُف یہ رعشہ۔ یہ بلا کا ضعف۔ یہ طبعِ حزیں
بیٹھ کر اُٹھنا مصیبت۔ دو قدم چلنا محال — قصد ہوتا ہے کہیں کا۔ پاؤں پڑتے ہیں کہیں
دست و پا سوکھے ہوئے ایسے کہ چرم و استخواں — پوپلا منھ۔ جھرّیوں سے سر بہ سر اِک مُشتِ چیں
ابروؤ مژگاں بردت وریش سرتا سر سفید — تھا یہی کا فور مشک اس کا نہیں آتا یقیں

پُشت خم گویا رکابِ تو سنِ عمرِ رواں — یا کمانِ کینہ خواہِ بسرِ پر خاش و کیں

سُن کے یہ تشریح بڑھا یوں ہوا گرمِ سخن — اے جواں اے رشکِ غلمانِ جنان و حورِ عیں
اے سہی۔ بالا صبا رفتار۔ مشکیں خال و خط — اے ترے رخسارِ سیمیں سیبِ تر۔ لب انگبیں
سچ کہا تو نے مگر ہے شرط بوڑھوں کا ادب — اب نہ ہو دستور تھا کالفرض لیکن پیش ازیں
مانتا ہوں میں جوانی کو کہ تھا میں بھی جواں — کیا بڑھاپا ہے ابھی اِس کی خبر تجکو نہیں
تجکو بھی سننا پڑے گا ایک دن میری طرح — میری باتیں گو ابھی اصلاً نہ ہوں گی دلنشیں

یا الٰہی ! مجکو ہونا ہے جو ایسا ہی ضعیف
اِس سے بہتر میں ابھی ہوجاؤں پیوندِ زمیں

❁

آزاد کی قصیدہ نگاری

قبل عرض کر چکا ہوں کہ حافظ فضل حق آزاد نے اردو شاعری کی تقریباً تمام اسالیب میں اپنی بصیرت و بصارت کا مظاہرہ کیا ہے لیکن آزاد کو چونکہ عربی و فارسی تہذیب و زبان پر کامل قدرت حاصل تھی اس لیے ان زبانوں کے اثر سے مدحیہ نظموں کی طرف رُخ کیا جسے صنفی اعتبار سے قصیدہ کہا گیا ہے۔ لیکن آزاد نے قصائد کو صرف مدح یا زم تک محدود نہیں کیا بلکہ روشِ زمانہ کے ساتھ اُس کے موضوع میں وسعت پیدا کرنے کی بھی کوششیں کیں۔ تمام تر تلاش و جستجو کے دوران آزاد کے جو قصائد میسر ہیں انہیں مدحیہ یا وعظیہ قصیدے کہہ سکتے ہیں۔ ہر چند کہ قصیدے کی چار قسمیں مدحیہ، ہجویہ، وعظیہ اور بیانیہ ہیں۔ اور چونکہ آزاد کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ عربی، فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال پر ید طولیٰ رکھتے تھے اس لیے قصیدے کی زبان کا جو معیار لازم ہے اس کے لیے ان کے اندر بے چارگی نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ قصیدے کی زبان شاندار اور لب ولہجہ پُر شکوہ ہوتا ہے الفاظ کی شان و شوکت، ترکیبوں کی بلند آہنگی، جوش اور جزالت اس کا معیار ہے۔ پروفیسر سید حسن کا بیان ہے کہ:

> ''قصیدہ نگاری میں آزاد نے تمام روایتی لوازمات کی رعایت کی ہے، مدحیہ قصیدوں میں تشبیب، مخلص، مدح، مدعا سب اجزاء موجود ہیں۔ کلمات جزیل و متین، الفاظ بلند آہنگ، ترکیبیں معنی خیز، مطالب عالی، مضامین پُر از مبالغہ، اسلوب میں استحکام و فخامت، صناعات شعری کا مناسب استعمال۔ یہ تمام اوصاف جو قصیدے کے لئے ضروری ہیں آزاد کے قصیدوں میں بڑی خوش سلیقگی سے فراہم کئے گئے ہیں۔ زبان و بیان کی وہ مہارت و مشق ہے کہ کسی اہلِ زبان کے قلم سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔''

جناب سید حسن کے اس بیان کا آخری جملہ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے یا تو وہ آزاد کو اہل زبان فارسی نہیں مانتے یا پھر ایران النسل کو ہی فارسی کا اہل زبان مانتے ہیں کیونکہ اس بیان کے بعد

انہوں نے آزاد کے فارسی قصیدہ ہی سے گفتگو کو آگے بڑھایا ہے۔ پروفیسر سید حسن کا بیان ہے کہ ''ان (آزاد) کے قلمی ذخیرے میں کل تیرہ قصیدے دستیاب ہیں اور اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے کہ:

نظام الملک آصفجاہ فرمانروائے دکن کی مدح میں	دو قصیدے
ملکہ وکٹوریہ کی ستائش میں	ایک قصیدہ
جشن جوبلی کی تہنیت میں	دو قصیدے
محمد مہدی صاحب کلید بردار دروازہ کربلا کی مدح میں	ایک قصیدہ
محمد و محمود کی مدح میں	ایک قصیدہ
فخریہ	ایک قصیدہ
ہجویہ	تین قصیدے
قصیدہ بے نقطہ	ایک قصیدہ

بہار کے مشہور اخبار جس نے ملک گیر پیمانے پر اپنی پہچان بنائی تھی، ''الپنچ'' کے شمارہ نمبر ۳۹، جلد ۷، بتاریخ ۱۹/اکتوبر ۱۸۹۱ء کے صفحہ ۳ پر شائع یہ خبر ملاحظہ ہو:

''ناظرین کو معلوم ہوگا کہ پچھلے دنوں علی گڑھ سے ایک ڈیپوٹیشن حیدرآباد دکن کو گیا تھا۔ اوس ڈیپوٹیشن میں ہمارے صوبہ کے لائق تعلیم یافتہ وذی فہم رئیس، جناب مولوی حافظ فضل حق آزاد بھی تھے۔''

ڈیپوٹیشن کے حیدرآباد پہنچنے پر ۱۳/صفر کو بشیر باغ میں ایک باوقعت جلسہ ہوا جس کے صدر انجمن عالی جناب نواب وقارالامرا بہادر تھے۔ جلسہ میں پہلے اسپیچیں ہوئیں پھر نظمیں پڑھی گئیں۔ ہمارے جدت پسند و عالی خیال دوست آزاد نے جو اپنی نظم اوس جلسہ اور دیگر معزز صحبتوں میں پڑھی اپنے ناظرین اخبار کی خاطر سے درج اخبار ہے۔''

پھر چار رباعیاں اور ایک قصیدہ اردو میں شامل ہے۔ ملاحظہ ہو وہ قصیدہ:

اوٹھ نکل دل سے کہیں اے یاس جا بس چلا جا   گھر یہ تیرا ہی ہے، تیرا ہی ہے، آ امید آ
پاؤں پھیلائے پڑے سوتے تھے ہم غفلت کی نیند   یک بیک سید کے نعروں نے ہمیں چونکا دیا

۱؎ مطالعۂ آزاد، ص۹۴

کون سید یعنی سر سید، وہ کہ جس کی کوششیں   قوم کے حق میں ہیں امرت، بلکہ امرت سے سوا
جب ہوا میلان انگریزی کے جانب قوم کا   تب علی گڑھ مدرسہ، نام خدا کھولا گیا
گر نہ ہوتی آصفیہ دولت اس کی سرپرست   اس کے چلتے چلتے رہنے کا نہ تھا کچھ آسرا
بس وہی، اک سرپرستی ہے کہ جس کی آس پر   کھینچ دیا حیدرآباد، اپنے دل کا ولولہ
سب سے بڑھ کر اس ڈیپوٹیشن کو جس پر فخر ہے   باریابی کا شرف ہے جو اوسے حاصل ہوا
پھر جو دربارِ نظام الملک میں ہو یا ریاب   ایسے حاجت مندوں کی کیوں کر نہ ہو حاجت روا
کہہ چکا آزادؔ جو کہنا تھا، بس خاموش ہو   وہیں ابوابِ اجابت، ہاتھ اٹھا بہر دعا
چلتے چلتے مدح میں شاہ سلیماں جاہ کی
جو قصید فارسی میں تو نے لکھا ہے سنا

یہ قصیدہ کل ۳۷/اشعار پر مشتمل ہے۔ اسی موقع پر پڑھا گیا ان کا فارسی قصیدہ بھی شامل کیا گیا ہے جو ۵۹/اشعار پر مشتمل ہے اور تین مطلع ہیں۔ تشبیب میں عید کی آمد اور اس کے مناظر کی منظر کشی خوب خوب کی گئی ہے لیکن مونوگراف کا خیال کرتے ہوئے نظام الملک آصف جاہ ثانی فرمانروائے دکن کی مدح میں کہے گئے صرف تین اشعار ملاحظہ ہوں:

بہار گلشن اسلامیاں نظام الملک   کہ نظم ملک زدستش بجای خویش رسید
بسا کمینہ غلامان اور فریدون فسر   بسا وظیفہ ربا یانش ہمدم جمشید
شجاعت آمد و برخدمتش مہان بربست   سخاوت آمدو بردرگہش زمین بوسید

۱۸۸۶ء میں ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ حکومت کی خوشی میں برطانوی مملکت میں جشن جوبلی کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ جشن ہندوستان میں بھی منایا گیا۔ آزاد اس زمانہ میں کلکتہ میں تھے اور اس جشن کے لیے کلکتہ کو جس طرح سجایا گیا تھا یا رقص وموسیقی کی محفلیں سجائی گئی تھی آزاد نے ان سب کو ایک فنکار کی نگاہ سے دیکھا تھا اور اپنے احساسات کو قصیدہ کے قالب میں اس طرح ڈھالا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بہار آمد نگار آمد نگار دلکش دلبر   بدہ ساقی مئی باقی بشتاقان و بکشادر
بگلزار و بکہسار و بمیخوار و بمی خانہ   صبا گلریز وعنبر بیز و حیرت خیز و کیف آور
بحر من ژار بر ژار بگلشن لالہ برلالہ   عنادل برچمن والہ چمن چوں عارض دلبر

یہاں تشبیب بہاریہ کا سرجوش دیکھائی دیتا ہے تو کلکتہ کی آرائش وزیبائش کا منظر ملاحظہ ہو:

زمستانست وبستانست ومستانند و ہندوستان	پرستان ہست کلکتہ چہ کلکتہ یکی کشمر
بہ تمکین و بہ تزئین و بآئین و بآرائش	تو گوئی ہیچو آن شہری ندیدہ خسرو خاور
....	....
طلسمات است یا خوابست حیرانم کہ می بینم	چمن سیارہ می گردد بہر کوی و بہر منظر

اس قصیدہ میں آزاد نے نہ صرف یہ کہ جشن کے نظاروں کی منظر کشی کی ہے بلکہ اس کے آرائش وزیبائش میں لگے لوگوں کا منظر بھی پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ قصیدہ بھی طویل ہے اور اختصار میری مجبوری۔ حافظ فضل حق آزاد کی شخصیت کا دوسرا رخ جوان کے قصیدہ میں منور ہوا ہے اس سلسلہ میں پروفیسر سید حسن کے اس بیان سے استفادہ کی ضرورت ہے:

> ''تیسرا چانٹا'' ایک فکاہی قصیدہ ہے۔ اس میں بڑی گھناونی اور رکیک باتیں ہیں۔ آزاد اپنے مخالف سے اس قدر برہم ہیں کہ دشنام طرازی اور فحش گوئی سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ تہذیب وسنجیدگی کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ[1] کسی ایسی نظم کے جواب میں ہے جس میں اسی قسم کا لب ولہجہ استعمال کیا ہوگا''

یہ قصیدہ بھی بہ زبان فارسی ہے۔ آزاد نے ایک قصیدہ بی نقطہ بھی تحریر کیا ہے جو''چوتھا چانٹا'' کے عنوان سے ہے، جو بنیادی طور پر اپنے مخالفین پر علمیت کا روب ڈالنے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ حافظ فضل حق آزاد نے نظمیں اور قصائد اتنے طویل لکھے ہیں جسے بطور نمونہ پیش کرنا یہاں مشکل ہے۔

لہٰذا صرف ایک قصیدہ ملاحظہ ہو۔ جسے آزاد نے شیخ محمد صاحب آفندی کلیدبردار زادہ کربلائے معلیٰ کی مدح میں لکھا جب وہ پٹنہ تشریف لائے اور قاضی سید رضا حسین کے مہمان رہے تھے۔ یہ قصیدہ اخبار ''الپنچ'' پٹنہ کے شمارہ ۸، جولائی ۱۸۸۹ء میں شائع بھی ہوا۔

دمے کہ صبح بہ مشرق و مید و آمد باد	سرود نغمۂ مرغاں بہ گوشِ ہوش فتاد
اگر چہ داعیہ صبح بود بیداری	ہنوز چشم پر از خواب بود و می نہ کشاد
گہے نشستم و گہہ سر بہ بالین افگندم	گہے کشودم و گہہ چشم خود بہ خواب فتاد
ہمین معاملہ تا دیر ماند وقت سحر	کہ از خواص یکے چہرہ حور نور نژاد

برفت و جام وصراحی گرفت و پیش آورد	دویدم از پئے گلگشت باغ بادل شاد
زہے بہار و زہے بوستاں زہے گلشن	خوشا زمیں و خوشا آسماں و خوش روداد
نظارہ کردم و لختے بہ حیرت افتادم	کہ از گل ایں ہمہ گلہائے نو بہ نو چوں زاد
چگونہ شد کہ وجود آفریدہ شد زعدم	چگونہ شد کہ نبات آفریدہ شد زجماد
چگونہ گشت کہ آتش در آب جائے گرفت	چگونہ گشت کہ خاک آرمیدہ اندر باد
چگونہ شد کہ بہم داد دوستی دادند	چگونہ شد کہ بہم جمع آمدند اضداد
چگونہ شد کہ گلستاں شد است غیرت خلد	چگونہ شد کہ بیاباں شد است خلد آباد
چگونہ شد کہ بہ شکرِ بہار، خاک خموش	زباں ز سبزہ گرفت و بپائے سرو فتاد
چگونہ شد کہ بہار آمد و خزاں بگریخت	چہ شد کہ غلغلہ در صحن بوستاں افتاد
کہ کرد ایں ہمہ افسوں کہ خواند ایں ہمہ سحر	کہ دارد ایں ہمہ حکمت گر است استعداد
خدای ماست کہ ایں جملہ از مشیتِ اوست	بغیر یاری خلق و بغیر استمداد
ز خاک نخل بر آورد و ہم رطب آویخت	ز شاخ گل بہ دمانید و رنگ و بوہم داد
ز سنگ لعل عیاں کرد و گوہر از دریا	ز نطق قفل شکست و درِ سخن بکشاد
ہزار شکر کہ مابندہ بے نصیب نیم	از ایں عطیہ کہ خاص است بہر آدم زاد

اے آنکہ از قدمت شد ارم عظیم آباد	بمیزبان تو از من دو صد مبارک باد
بمیزبان چنیں می سزد چنیں مہماں	بمیزبانی او چوں تو مہماں برساد
چہ میزباں و چہ مہماں غلط غلط گفتم	کہ میزباں توئی و میہماں پاک نہاد
دریں یگانگی و یک دلی کجا گنجد	دوئی کہ خرمن او سوختہ است و سوختہ باد
خو شاد مے کہ دو اخوان شگفتہ بنشینند	کہ خوش نشستن شان رنج می برداز یاد
بلے کہ تابش جوہر دو چند می گردد	چو در مقابل آئینہ آئینہ افتاد
بچشم دل چو ہمی بنگرم ہمی بینم	قرآنِ سعدِ دو اختر شد است و می شدہ باد
نجوم برج سعادت شموسِ چرخ کمال	عیون شخصِ شرافت روشِ اہل رشاد

[1] مطالعہ آزاد، ص ۱۲۳

یکے ز خلق محمد یک از شرف محمود
یکے عمود چشم حلم را یکے است عماد

یکے جہاں محبت یکست جان خلوص
یکے زمین مردت یک آسماں دواد

یکے فصیح زباں و یکے بلیغ بیاں
یکے بہ نثر مجدِّد یکے بہ نظم استاد

مقام شکر و سپاس خدائے بیچون است
کہ ہر دو پاک سرشت اندو ہردو پاک نہاد

چگونہ درد ہم از یاد حق صحبت او
کہ خدمت توازاں صحبت اتفاق افتاد

ہم از زباں فصیحش شنیدہ ام اوزے
کلام طرفہ نظامت کہ کہ ذوقش افزوں باد

کشادی از سر زلف سخن بنا خن فکر
ہر آں گرہ کہ ز خاصان باسبق، نہ کشاد

بہار نظم نور رنگیں و بالَبش مضمون
نگارِ شعر تو شیریں و معینش فرہاد

بہ پیش فکر تو نادان چہ فلسفی چہ حکیم
ز زلفِ کلکِ تو حیراں چہ مانی و بہزاد

بَہر زدِش کہ تو دانی سخن توانی گفت
کہ حاصل است تراز و رِ بازوئے ایجاد

ہنوز و صفِ تو ناگفتہ ماندم ہر چند
ز آسماں بودم صفحہ و زبحر مداد

کنوں ز مستیٔ دور تو بس عجب نہ بود
کہ بادہ بگدَ فَوُ از سرحد خطِہ بغداد

زر شحہ قلمت عرقۂ عرق دشمنی
ز نقطۂ رَقمتَ کوہ بر دلِ حسّاد

د میکہ بزم تو رندانِ مست بر خوانند
عنان صبر و ہند از کف خِرَد حُسَّاد

وگر کہ و زم تو خوانند میر سد کہ ز جوش
بجام جام در افتد ببادہ جنگد باد

نگفتم از سردعوی مگر توان گفتن
کہ چو تو اہل سخن مادرِ زمانہ نہ زاد

ہر انچہ کردۂ از کس نہ شد خدا شاہد
ہر انچہ گفتیٔ نامد ز کسی برَبِّ عباد

شنیدم انچہ سخن از زبانِ خاص نہ بود
ہم از زباں تو حرفے بگوش دل زدہ باد

امید دارم و از فرطِ شوق منتظر ام
بگوش ہوش کہ ایاچہ می کنی ارشاد

منم کہ داشت سرِ من ہوائے آزادی
کنوں اسیر تو گشتم بجان توئی آزاد

مپرس من کیم و خاکدان من چہ بود
کہ آن زمانہ کہ بگزشت خواہد آمد یاد

زمانہ بود کہ اہل کمال بودستند
در ایں خرابہ کہ نامش بود عظیم آباد

بجائے مرقد راسخؔ، مدام سایۂ لطف
بخاکِ مدفن بیدل ہزار رحمت باد

کہ جان جسم سخن بودہ اند و اہل سخن
کہ فخر اہل وطن بودہ اندہ و فخر بلاد

ازاں گردہ کس اکنوں دریں زمانہ نہ ماند
کہ داد حسرت یارانِ ہموطن میداد

فغاں کہ موسم عشرت گذشت و دیر نہ ماند
فغاں کہ دور فلک باکساں خلاف افتداد

کسے نہ ماند ز اہل کمال و اہل ہنر
کسے نہ ماند ز اہل رشاد و اہل سِداد

رسید کار بہ جائے کہ طفل مکتب درس
قلم نہ گبرد و گردد بہ زعم خود استاد

بہر کہ من نگرم ہست صاحب تصنیف
زہر کہ می شونم ہست صاحب اسناد

سخنوران ہمگیں فرقہ فرقہ می باشند
کہ خواندہ اند بہ فرمان لِکُل قومٍ باد

دریں دیار بہ بزم سخن ہمی رسم است
کہ داد فرقہ فریق و گرنہ خواہد داد

جہاں بہ طبع خلاف است و دل نہادہ مکیں
زمانہ بر سرجنگ است و درپئے آزاد

زہر رخیست عیاں مہر و لطف و داد وکرم
بہر دلیست نہیں بغص و کینہ رشک و عناد

نہ یاوری نہ رفاقت نہ ہمدمی نہ خلوص
نہ راستی نہ صداقت نہ دوستی نہ وداد

ز حال درد دل خویشتن چہ شرح دہم
کہ من چو صیدم و فکر زمانہ چوں صیاد

رسید وقت درود و نکاشتم سخنے
برفت عمر گرانمایہ ہم چنیں برباد

چناں شدست زبوں حال من ز دل تنگی
کہ شیشہ بر سرسنگ ارزنی کشتم فریاد

ازیں قدر کہ بہ اظہار حال کو شیدم
توقع انکہ گزندے بخاطرت مِرساد

اگرچہ قافیہ تکرر ریافت با کسے نیست
کہ قدردانیٔ ممدوح واد خواہد داد

ہماں خوش است کہ دست دعاء برافرازم
کنوں کہ ختم سخن طبع راست پیش نہاد

ہمیشہ دست ترا رحمت خدا شامل
مدام حفظ ترا فضل حق نگہہ دارد

آزاد کی مثنوی نگاری

علامہ فضل حق آزاؔد کے شعری سرمایہ میں اردو اور فارسی دونوں ہی زبانوں میں مثنویاں بھی ملتی ہیں۔لیکن مثنویوں میں بھی نظم اور قصیدہ کی سی طوالت ملتی ہے۔آزاد کو چونکہ حالی کے مدرسہ سے قربت تھی اور حالی کا بیان ہے کہ ''اصناف سخن میں سب سے زیادہ کارآمد صنف مثنوی ہے۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا فن توضیحی ہے اور اس میں ہر قسم کے مسلسل مضامین وخیالات کے مربوط اظہار کی گنجائش ہے۔'' شاید اس لیے کہ مناظر قدرت، فلسفہ وتصوف کے طویل مباحث، حسن وعشق، رزم وبزم کی داستانیں اس صنف میں بخوبی نظم ہوسکتی ہیں۔اس صنف کی ابتداء ۱۰۱۸ھ قطب شاہ فرمانروائے گولکنڈہ سے ہوئی اور انہوں نے ایک مثنوی لغت میں لکھی جو دکنی زبان میں تھی اور پھر مثنوی کا دور چلا تو محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی تک آتے آتے مثنوی نگاری نے حقیقت پسندانہ روایات کو پروان چڑھایا جس نے فضل حق آزاد کو بھی متاثر کیا چنانچہ آزاد نے بھی محمد حسین آزاد اور حالی کی طرح صاف وسادہ حقیقی یا فطری جذبات وخیالات کو مثنوی کے فارم میں ڈھالنے کی کوشش کی وہیں محمد حسین آزاد اور حالی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے بھی مثنویوں میں آغاز خمریات سے کیا ہے۔ایک مختصر مثنوی ''دل کی آرزو'' ملاحظہ ہو:

نہ چھیڑ اب ساز بے ہنگام ساقی — لگا میکش کے منہ سے جام ساقی
وہ مئے دے جس سے ہنسی ہو فراموش — مجھے بے ہوشیوں میں آئے اک ہوش
نشہ اک مست ہاتھی بن کر آئے — مگر چیونٹی بھی دُکھ پانے نہ پائے
گرائے بجلیاں آہِ شرر بار — مگر تنکے پر آنچ آئے نہ زنہار
جہاں تاریک ہو دودِ جگر سے — گھٹا اٹھے مگر گلشن پہ برسے
نہ وہ موجیں نظر آئیں نہ گرداب — کنارا تھام لے طغیاں سیلاب
زیادہ آتش گل بھی نہ ہو تیز — ہوا چلنے نہ پائے وحشت انگیز
پریشاں زمرے ہوں ناگوارا — بھرے پھولوں سے دامان نظارا

نہ ہو سرشار دورِ جام مُل بھی — کڑی ہونے نہ پائے بوئے گل بھی
نہ کانٹے بھی کسی سے نوک کی لیں — نہ رعنائی پر اپنی پھول پھولیں
شجر سرکش جو ہو پامال بہتر — زباں سوسن کی یکسر لال بہتر
جو گل ہو خندہ زن وہ داغ ہوجائے — جو بے پر کی آڑائے زاغ ہوجائے
نظر بازی کرے نرگس فراموش — نوا سنج چمن ہو جائے خاموش
چٹک کر دے صدا گر غنچۂ گل — لگائے تازیانہ شاخ سنبل
لگے تھم تھم کے چلنے بادِ صر صر — اِدھر شیشہ بھی آئے سر جھکا کر
ادب آموز ہو جام خموشی — حباب جو سکھائے چشم پوشی
نہ الجھے خار سے دامن کسی کا — بنے اوج ہوا مسکن کسی کا
نہ ہو بارِ گراں تکلیف مستی — مزا دے جائے ساقی مئے پرستی
نہ آئے وضع رندانہ میں کچھ فرق — سفینہ قلزم صہبا میں ہو غرق
نہ کچھ مطلب رہے خود مطلبی سے — بھلا ڈالے جہاں کو اپنے جی سے
مرا افسانہ ہو عنقا فسانہ — پرے ہو عرش سے بھی آشیانہ
پئے میخانہ ہو گلشن سے بڑھ کر — پیالہ ہو دِل روشن سے بڑھ کر
وہ ہوں نیرنگ اعجاز سخن کے — بطِ مئے اُڑ کے بوسے لے دہن کے
فروغ دیدہ صدق صفا ہو — سرور آئینہ وحدت نما ہو
تعلق چھوٹ جائے ما سوا کا — مزا بڑھتا رہے یکسر انا کا
مری لغزش ہو برقِ عافیت سوز — انانیت ہو میری غیریت سوز
نہ آنے دوں کسی سینے میں کینہ — نہ ٹوٹے مجھ سے کوئی آبگینہ
الگ اِک راہِ مئے نوشی نکالوں — مجازی تفرقوں پر خک ڈالوں
نہ رکھوں کام کچھ چوں و چرا سے
میں آنکھیں بند کرلوں ماورا سے

(الپنج، ۸/اگست، ۱۸۹۵ء)

۱؎ فضل حق آزاد: عصر، حیات اور فن، ۱۹۸۰ء، ص ۵۰۔۱۴۹

ڈاکٹر روحی حسن مجید آزاد کی مثنویوں کا مختصر تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

''حالی کی نظموں کی طرح آزاد کی مثنویاں بھی اصلاحی ہوتی ہے۔مگر یہ اصلاحی رجحان داخلی اور پنہاں حیثیت رکھتا ہے اور مثنوی کے جمالیاتی اور فنکارانہ پہلو کو نقصان نہیں پہنچاتا ہے۔آزاد کی ماجرا نویسی، ماحول نگاری اور منظر کشی کا یہ انداز ان کی ایک دوسری طویل نظم ''ہولی'' میں بھی نمایاں ہے۔''

دراصل آزاد کی مثنوی ''ہولی'' کافی طویل یعنی کل ۷۵ اشعار پر مشتمل ہے۔اسی طرح ان کی ایک مثنوی ''ذرا اس کی ابتداء اور انتہائی کو دیکھو'' میں اشعار کی تعداد ۹۲ ہے۔جس میں آزاد نے رات کے ڈھلنے اور صبح کی دھیرے دھیرے نمایاں ہونے کا نقشہ ہنرمندی سے کھینچا ہے تو ''سن چھیاسی کا کچا چٹھا'' ہر چند کہ سیاسی مثنوی ہے لیکن اس میں جابجا عصری واقعات وسیاسی شب خون مارنے کے چلن کی منظرکشی خوب نمایاں ہوئی ہے۔آزاد کے یہاں فارسی مثنویاں بھی ملتی ہیں جن میں زبان وبیان کی سادگی وسلاست، روانی الفاظ اور مضامین کی شگفتگی بھی ہے۔لیکن آزاد کی فارسی مثنویوں کے تعلق سے پروفیسر سید حسن کا یہ بیان قابل توجہ ہے کہ:

''مثنویوں سے بھی آزاد کی فارسی گوئی کی مشق ومہارت کا اظہار ہوتا ہے لیکن یہ مثنویاں طویل نہیں ہیں اور نہ ان کے مضامین ہی اہم ہیں۔کیونکہ نہ ان میں کوئی داستان بیان کی گئی ہے اور نہ ان کا موضوع حکمت ومعرفت، فلسفہ وموعظمت یا عشق ومحبت سے متعلق ہے۔بلکہ یہ مثنویاں زیادہ تر شادی کے منظوم دعوت نامے ہیں، جن کو 'رقعہ' کہا جاتا ہے۔''[1]

✿

[1] مطالعۂ آزاد، ص ۲۷۔۱۲۶

آزاد کی غنائی شاعری

فضل حق آزاد نے اپنے شعری کمالات کے اظہار کے لیے مرثیہ نگاری کے میدان میں بھی اپنی موجودگی درج کرانے کی کوششیں کی ہیں۔مرثیہ کے لغوی معنی ''وصف میت'' کے ہیں۔اس مناسبت سے ہمارے سادہ لوح فنکاروں اور تنقید نگاروں نے ایسی تمام نظموں کو مرثیہ کہنے پر زور دینا شروع کر دیا جو اپنے کسی دوست، عزیز یا کسی بڑے آدمی کے بچھڑ جانے پر لکھی جاتی ہے۔لیکن لغوی معنی کی مناسبت سے کہی گئی نظموں کو مرثیہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔کیونکہ ایسی نظمیں صرف ذاتی جذبات کا اظہار کرتی ہیں اس لیے ان کا تعلق غنائی شاعری سے ہے۔ہر چند کہ مولانا حالی نے بھی مانا ہے کہ ''زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی تعریف جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں۔'' ہمارے بزرگوں نے فضل حق آزاد کی غنائی شاعری کو اپنے مطالعہ میں لاتے ہوئے جن نظموں کو مرثیہ کا نام دیا ہے وہ اس طرح ہیں:

۱) مرثیہ علی امام بہ عنوان ماتم دل گداز
۲) مرثیہ تپش خورجوئی بعنوان تپش مرحوم
۳) مرثیہ ملکہ وکٹوریہ بعنوان ''کوش نہ ماند و بماند سیئہ فلک اورنگ
۴) مرثیہ سلطان نواب
۵) مرثیہ حکیم عبدالحمید پریشاں
۶) مرثیہ سید شاہ محمد اکبر داناپوری بعنوان ''رخت وصال''

غور طلب امر یہ ہے کہ مرثیہ سید شاہ محمد اکبر داناپوری بعنوان ''رخت وصال'' کتابچہ کی صورت میں سید شاہ محمد اکبر داناپوری کے انتقال ۱۴؍رجب المرجب ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء کے چند ماہ بعد ہی شائع ہوا اور تصنیف، تالیف یا کتابچہ کی صورت میں شائع ہونے والی آزاد کی یہ واحد تخلیق ہے۔گمان غالب ہے کہ

حضرت اکبر داناپوری کے ہی خاندان کے کسی شخص نے اسے شائع کرایا ہوگا۔ تلاشِ بسیار کے باوجود یہ تخلیق مجھے میسر نہیں۔ انوار محمد عظیم آبادی نے اپنے مضمون ''فضل حق آزاد اور مرثیہ رخت وصال'' میں اس کتابچہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''حضرت فضل حق آزاد کا ایک مختصر کتابچہ 'رخت وصال' بھی جو اگرچہ مطبوعہ ہے۔ لیکن شاید کسی مخطوطہ سے کم نہیں۔ اس کے سرورق اور چند اندرونی صفحات کے عکوس زیر نظر مقالہ کے ساتھ ہدیۂ قارئین ہو رہے ہیں۔ اس کی تقطیع ۲۰×۱۴ سنٹی میٹر ہے۔ سرورق ہلکے سبز کاغذ پر ہے جو ظاہر ہے کہ رنگ پریدہ ہو چکا ہے اور اندرونی اوراق بھی بے حد خستہ ہیں۔

سو سال سے زیادہ پرانے اس کتابچہ کی کیفیت یہ ہے کہ پہلے سرورق کے بعد دوسرے سرورق پر قطعہ تاریخ فارسی زبان میں ہے۔ تیسرے سرورق پر ''مرثیہ'' کا آخری بند اور صفحہ کا نمبر شمار ۱۷ درج ہے اور آخری سرورق پر ''اعلان''۔ حضرت آزاد کا یہ کتابچہ دراصل مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری کا مرثیہ ہے جس کی اشاعت اسی سال ہوئی جس سال انہوں نے وفات پائی۔''[1]

انوار عظیم آبادی نے کتابچہ کے جو سرورق کا عکسی شامل مضمون کیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ''رخت وصال'' سے مادہ تاریخ ۱۳۲۷ھ نکلتی ہے کہ ''رخت وصال'' کے نیچے ۱۳۲۷ھ درج ہے اور ناشر کی جگہ مطبع اخلاقی، پیر بہوڑ، پٹنہ درج ہے۔ انوار عظیم آبادی نے رخت وصال کا تعارف کراتے ہوئے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ یہ کل سترہ بندوں پر مشتمل ہے اور کتابچہ کے ہر صفحہ پر صرف ایک ہی بند ہے۔ لیکن میری معلومات کی حد تک اسے غنائی شاعری ہی کی ذیل میں رکھا جانا چاہیے۔ کیونکہ یہاں مرثیہ کے ساختمانی صنفی تقاضے ناپید ہیں اور ذاتی جذبات کا اظہار ہی اظہار ہے۔ صرف دو بند ملاحظہ ہو:

عرش پر دھوم ہے، سجادہ نشیں آتا ہے
غل ہے فردوس میں فردوس مکیں آتا ہے

[1] زبان وادب، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، نومبر ۲۰۱۲ء، ص ۲۷

مہمان حرم خالق اکبر، اکبر
بوالعلا کی ہے زباں پر اکبر، اکبر
اکبر آباد سے تا خانقہ داناپور
خاک اُڑتی ہے مگر خاک سے چھنتے ہیں نور
حیف صد حیف کہ خالی ہوئی صحبت تجھ سے
اکبر آباد تھا اک قطعہ جنت تجھ سے
کیوں نہ تاریک ہو دنیا کہ وہ رہبر نہ رہا
جوہری جس کے شناسا تھے وہ گوہر نہ رہا
قدردانِ سخن استاد سخنور نہ رہا
نہ رہا مونس جاں آہ وہ غمخوار افسوس
قافلہ چھوڑ گیا قافلہ سالار افسوس

فضل حق آزاد کی جن غنائی شاعری کو مرثیہ قرار دیا گیا ان میں ''صبح کربلا'' اور ''کردار امام حسین'' بھی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم کردار امام حسین پیش کر رہا ہوں:

لب تشنہ تھے جواں و صغیر و کبیر و پیر
بچے ہمک رہے تھے میسر کہاں تھے شیر
سو آفتوں میں سرورِ آفاق تھے اسیر
اور ایک سمت منتظر وقت تھے شریر
اس پر بھی صبر وشکر کا عالم جو تھا سو تھا
یعنی ادائے فرض مقدم جو تھا سو تھا
لب پہ گلہ نہ دل میں شکایت نہ اضطراب
ابرو پہ بل نہ کاکلِ مشکیں میں پیچ و تاب
ثابت قدم تھے زیر قدم تھی رہ صواب
مہر سپہر صبر و رضا ابن بو تراب

تھی اتباعِ حق میں جو برجستگی سو تھی
طاعت میں پہلے تھے جو کمر بستگی سو تھی

فاقوں میں پڑ کے روح کو تھی تازگی وہی
کمھلا گئے تھے پھول پہ بو باس تھی وہی
تیور وہی مزاج وہی عزم بھی وہی
حق کی طرف خیال وہی تندہی وہی

یادِ خدا میں دل ہمہ تن غرق اب بھی تھا
آگے جو حالِ دل تھا بلا فرق اب بھی تھا

گویا آزاد کی ان غنائی نظموں میں موضوع کے اوصاف ومحاسن کے بیان میں جذبات کی صداقت کے ساتھ ساتھ شعری اُسلوب ضرور دکھائی دیتا ہے۔ایک مرثیہ حکیم عبدالحمید پریشاں ملاحظہ ہو:

مرثیہ حکیم عبدالحمید پریشاں

ازل سے تیغ عریاں لے اجل ہے تیری بیبا کی — نئی کچھ تو نہیں اے دشمنِ جاں تیری سفّا کی
تیری چالا کیوں سے دم بخود ہیں آبی و خا کی — چلی ہے کب ترے آگے مسیحائی مسیحا کی

مٹایا ہے انہیں جو زندہ و جاوید آئے تھے
اسے مارا ہے جس نے سینکڑوں مردے جلائے تھے

طِب اس سے زندہ تھی عِلم ادب کو اس سے طاقت تھی — اصول وفقہ ومعنی ، بیاں میں عام شہرت تھی
ریاضی میں عجب چلتی ہوئی اس کی طبیعت تھی — بیانِ مختصر یہ ہے غضب کی جامعیت تھی

وہ علامہ تھا خلّاقِ معانی علم ایسا تھا
مسیحا جس کو روتے ہیں مسیحا وہ مسیحا تھا

صحیح الرای تھا تشخیص میں تخصیص اس کی تھی — شفا کہیتی تھی خود لبیک وہ تشخیص اس کی تھی
بہ وقتِ درس تعریضیں نہ تھیں تلخیص اسکی تھی — ظریفانہ اشارت از پے تخلیص اس کی تھی

دمِ بحث سخن بند اُس سے جالینوس ہوتا تھا
خیالِ بحث اُس سے مورثِ کا بوس ہوتا تھا

کوئی کیسا ہی نامی ڈاکٹر ہو یا سول سرجن — یہ ناممکن کسی سے بند ہو جائے وہ صاحب فن
بیاں میں سادگی جسمیں کہیں کاوش نہ کچھ الجھن — زباں چلتی تھی قینچی کی طرح ہر چند تھا الکن

وہ لکنت کیا مزے دیتی تھی کانوں کو سماعت میں
طلاقت سجدے کرلیتی تھی محراب عبادت میں

افلاطون زماں لقمان دوراں اکمل الکملا — جو سچ پوچھو تو اپنے وقت کا تھا بو علی سینا
ادب میں تھا نہ کم سحبان وائل سے وہ ذی رتبا — جواب صبعہ لکھے تھے قصائد اس نے بھی سینا

زمانے سے نرالا خاص اس کا ایک مسلک تھا
دم رزمِ سخن فردوسیِ طوسی بلا شک تھا
سپہر علم تھا لیکن نہ وہ عمامہ بر سر تھا   زمین حلم تھا لیکن قدم برچرخ اخضر تھا
نمازیں تھیں مگر قیدِ مصلّے تھا نہ منبر تھا   تکلّف سے مبرّا کس قدر اللہ اکبر تھا
وہی ہے ایک شانِ سادگی مسکن سے مدفن تک
کہ پہنچا تھا تقدّس عالموں کا اسکے دامن تک
عمیم الخُلق بحرالعلم دریائے سخندانی   عیاں رخسارۂ انور سے سیمائے مسلمانی
وہ پرتو علم کا جس سے بیاض چہرہ نورانی   مگر پایا تھا خضرِ رہنما سے فیض روحانی
نہ چھوٹا اسکے دستِ پاک سے دامن شریعت کا
زیاں کاری سمجھتا تھا بچھانا دام شہرت کا
ہزاروں میں بتاؤ ایک بھی ایسا بھلا پایا   زمانے بھر سے اس کو ایک عالم نے جدا پایا
کسی نے ذہن ہی پایا کسی نے حافظہ پایا   مگر اس نے جو پایا وہ تو دونوں ہی بلا پایا
اگر وہ چاہتا تو فکر دکھلاتی بہار اپنی
مگر اک بے نیازی اس نے چھوڑی یادگار اپنی
پریشاؔں تھا تخلص شاید اس کا تھا یہی مطلب   تصانیف اسکی اوراقِ پریشاں ہونگی سب کی سب
وہ انکو جمع کرتا اتنی فرصت تھی مطب سے کب   مگر تھی شعر گوئی اسکے بائیں ہاتھ کا کرتب
زباں پر تھا جو یاروں سے نہیں ہوتا مہینوں میں
طرارے تھے قلم کے دیدنی مشکل زمینوں میں
بہ ظاہر آ گیا تھا فرق آنکھوں کی بصارت میں   مگر تھا نور بینائی وہی چشم بصیرت میں
نشاں صفحوں کی بتلاتا تھا جب اپنی صداقت میں   تو کھجلاتی تھی آنکھیں طالب آجاتے تھے حیرت میں
وہ اپنی چشم نابینا سے بھی وہ کام لیتا تھا
کہ بینا چشم جو تھے ان کو سوا لزام دیتا تھا
کہاں پائیں گے ہم ایسا طبیب ایسا سخن گستر   زباں تھی یا کلیدِ گنج معلومات سرتاسر
تعصب سے بری روشن دماغی میں تھا نام آور   مزاج ایسا کہ اس سے بے تکلف اکبر واصغر

سمجھتا تھا وہی پایہ محقق اور مہوس کا
اسے معلوم تھا البتّہ علم آداب مجلس کا
اگرچہ دے رہی تھی دیر سے پیغام غم پیری   گماں تھا رحم کھائے گی نہ توڑے گی ستم پیری
کر یگی صدمۂ ناگاہ کے شیون کو کم پیری   یکا یک آپڑا جانوں پر اک کوہِ الم پیری
وہ دن تو نے دکھایا جو نہ اس دنیا نے دیکھا ہو
جوانہ مرگ نے شاید نہ دل اتنا دکھایا ہو
وحید العصر یکتائے زماں استاد نام آور   کہاں یہ جامعیت ہے کہ ہوا اسکا کوئی ہم سر
یہ دریا تیر جائے گا کوئی مجھ کو نہیں باور   صدف تھا یہ عظیم آباد گویا اور وہ گوہر
نہ کیونکر آٹھ آٹھ آنسو عظیم آباد روئے گا
اسے آزؔاد ہر شاگرد ہر استاد روئے گا

(الپنچ، ۱۷/اگست ۱۹۰۵ء)

آزاد کی رباعی نگاری

علامہ فضل حق آزاد کے سرمایہ شاعری میں اسالیب شاعری کی صنف ''صنفِ رباعی'' کا بھی خاصا سرمایہ موجود ہے۔ اور آزاد نے اس صنفِ ادب میں اچھے تجربے کیے ہیں۔ یہ امر واقع ہے کہ رباعی فارسی نژاد ہے اور آزاد فارسی ادب کے تجربہ گاہ، جس کا تجربہ نظموں، غزلوں اور قصائد پر گفتگو کرتے ہوئے بطور تجزیہ ان کی زبان دانی کا ذکر آیا اور یہ آزاد کی فارسی دانی ہی کا ثمرہ ہے کہ ان کی رباعیوں میں ہر طرح کے موضوعات، خواہ اصلاحی ہوں یا کہ قومی و مذہبی مسائل مناسب پیرایۂ بیان میں پیش کرنے کا ہنر بہ درجہ اتم موجود ہے۔ آزاد کی رباعیوں میں قدرت کے حسین شاہکاروں کی منظر کشی بھی ملتی ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ذکر بھی ملتا تو کُلِّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْت کا ذکر بھی ملتا ہے۔ آزاد کی رباعیوں میں کہیں کہیں انسانی فطرت پر طنز سبک کا اظہار بھی ہوا ہے، تو کہیں حالی اور شبلی سے بے پناہ عقیدت کا اعتراف بھی ملتا ہے۔

پایانِ حیات ہے کڑی منزل ہے　　گرداب فنا میں نقش آب و گل ہے
اس حال میں کیا ہو کوئی خدمت انجام　　قابو میں نہ دست و پا نہ بس میں دل ہے

گویا شاعر کو زندگی دشوار گزار دکھتی ہے کہ جہان آب و گل میں موت کا خوف ہر لمحہ کھٹکتا رہتا ہے۔ چنانچہ زندگی کے سارے منصوبے بہ مشکل ہی حل ہو پاتے ہیں۔ آزاد کو اس بات کا شکوہ بھی ہے کہ جب انسانی اعضا بھی اس کے قابو میں نہیں ہیں تو بھلا کوئی خدمت کیونکر مکمل ہو سکتی ہے۔ دراصل آزاد مذہب کے سلسلے میں اکثر عقلی رویہ اختیار کرتے ہوئے دکھائی دیتے اور ان کا یہ رویہ ان کی نظموں میں بھی دیکھا یا جا چکا ہے:

حیراں ہے یہ دل تجھ سے دعا کیا مانگے　　کیا منہ سے کہے غریب کیا کیا مانگے
دو دن کی تو عمر اور اتنے ارماں　　آزاد کو اب تو ہی بتا کیا مانگے

مرنا معلوم اس کی پرسش کیا ہے　　جینا محدود اس کی کوشش کیا ہے
اللہ کو پوجتا ہے پوجے مسلم　　لیکن اسے حاجتِ پرستش کیا ہے

آزاد کو اس بات کا اقرار ہے کہ ہر کام کی ابتداء ذات باری تعالیٰ کے حکم سے انجام کو پہنچتی ہے۔ ساتھ ہی یہ حسرت بھی ہے کہ جس طرح موسیٰ کو طور پر بلا کر خود سے گفتگو کی جرأت بخشی۔ کچھ اسی طرح میرے کلام کو بھی قبولیت عام سے نواز دیا جائے:

اے خالقِ ذوالعلیٰ عزیز العلام　　پایا ہے ہر آغاز نے تجھ سے انجام
موسیٰ کو کلیم جب کیا ہے تو نے　　مقبول انام کر ہمارا بھی کلام

چند رباعیاں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

رباعیات

کیا صوم و صلوٰۃ و خطبۂ آدینہ
توحید کا آئینہ نہیں جب سینہ
کیا ایسی عبادتوں میں خیر و برکات
دنیا طلبی کا حق پرستی زینہ

☆

ظاہر میں تو اسمائے خدا درد زباں
دل میں وہی کافروں کے دل کے ارماں
اولاد، اقبال، عمر، دولت، نصرت
عقبیٰ، نہ رضائے حق کا کچھ نام ونشاں

☆

کیا فرق ہے کفر ودیں حق کے مابین
لازم ہے کہ یہ فرق رہے نصب العین
اے وائے ہے کس قدر مقامِ عبرت
قبریں بتِ مسلم ہیں بشنید حرمین

☆

آزاداوراردوصحافت

فضل حق آزاداپنے عہد کے ان بڑے ادیبوں میں سے ہیں جنہیں یقیناً کثیر الجہات اور جامع کمالات کہا جاسکتا ہے۔انہیں عظمت کی بلندی تک پہنچانے میں جن محرکات نے اہم رول ادا کیا ان میں تربیت اجداداور خود آزاد کی قوتِ ارادی کو فوقیت حاصل ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکارنہیں کیا جاسکتا کہ فن کار کی تعمیر وتشکیل اور فروغ وارتقاء میں متعلقہ عہد کی روش، معیارِ فن، اساتذہ کا ذہنی اور علمی معیار، احباب و مشاہیرفن مثبت ومنفی اثر ڈالتے ہیں۔آزاد کی شخصیت بھی ان اثرات سے خالی نہیں کہ جہاں بہار میں شاد عظیم آبادی صفیر بلگرامی، شوق نیموی، اوراثر عظیم آبادی دنیائے شاعری پر حکمرانی کررہے تھے وہیں فصلِ حق آزاد بھی اپنی ہمہ دانی کا سکّہ قائم کررہے تھےاور پھر سر سید حالی اور شبلی کی درستگاہوں میں بھی ان کا داخلہ ہو چکا تھا۔ فضل حق آزاد جہاں ایک طرف سرسید کی اصلاحی تحریک میں معاون ثابت ہورہے تھے وہیں حالی وشبلی ان کی زبان دانی کے قائل ہو چکے تھے۔چنانچہ اصلاحی تحریک کے مقاصد کے تحت عام عوام سے اپنا رشتہ قائم کرنے یا عام عوام تک اپنے مسلکِ علم کو پہنچانے کے لیے آزاد نے ۱۵رستمبر۱۹۰۲ءکو پندرہ روزہ اخبار''تاج'' محلّہ پیر بہوڑ، پٹنہ سے شائع کیا۔ یہ پندرہ روزہ اخبار تھا۔ جناب آزاد ہی اس کے مدیر بھی تھےاور مالک بھی۔کئی اہل علم کے ذہن میں یہ بات محفوظ ہے کہ''تاج'' ماہنامہ تھا تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ''تاج'' ماہنامہ گیا سے جگیشر پرشاد خلش نے ۱۹۱۸ء میں جاری کیا تھا۔بہرکیف جناب آزاد نے پندرہ روزہ''تاج'' جاری کرتے ہوئے اپنے مقاصد یوں تحریر کیے تھے:

''تہذیب، اصلاح حال، حمایت حقوق، اعانتِ اہل جوہر اور متقدمین شعرائے بہار کے کلام کو زندہ کرنا۔''

گویا پندرہ روزہ''تاج'' میں عمومی خبروں کے لیے جگہ کم تھی اور علمی وادبی مضامین کو بنظر احسن شائع کیا جاتا تھا۔جس کی داد دیتے ہوئے اس عہد کے نامور ادیب وشاعر اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے بھائی ابونصر محمد یٰسین آہ نے آزاد کو لکھا کہ:

''میں بے رورعایت کہتا ہوں کہ آپ نے ملک پر احسان کیا۔آپ تحریری قوت کے ہاتھوں قوم کو لغزشوں سے بچا کر دست گیری کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ میں آپ کے تاج کو قوم کے سر کا تاج سمجھتا ہوں ۔جس کے بے بہار اور انمول دُرہائے مضامین علمی بازار میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔بارک اللہ۔آپ تاج کو تاج کہتے ہیں۔ میں تاج کو آئینہ کہتا ہوں۔ یہ قوم کے سر پر بھی رکھنے کے قابل ہے اور آنکھوں کے سامنے بھی۔مصلح کامل کو میرے خیال میں آئینہ کہنا مناسب ہے۔لہٰذا میں نے اس تاج کو آئینہ کہا۔دیکھئے آپ کیا کہتے ہیں۔قوم کو علمی تخت پر بیٹھنا اگر منظور ہو تو اس تاج کو سر پر رکھے۔مگر صرف سر پر ہی رکھ کے خیر باد نہ کرے بلکہ اس کو دل میں بھی جگہ دے۔ .....آپ کے جیسا اڈیٹر جس علمی اخبار کو نصیب ہوا، اس کے نصیب کا پھر کیا پوچھنا:

سرتاج ہے پرچوں کا سردار اسے کہتے ہیں
یہ تاج ہے دیکھو تو اخبار اسے کہتے ہیں''

جناب آہ نے جلد نمبر 1 کی بھی خوب تعریف کی اور لکھا کہ:

''قوت بیانیہ، تاثیر خیال، دل ودماغ، مسلمانانِ ہند اور تعلیم، تصنیف وایجاد، بخل واسراف، خرقے کی ترقی، آپ کا ہر مضمون لاجواب ہے بس لاجواب، لطف کلام کے کیا کہنے بس فوٹو کھینچا گیا ہے۔نظم علمی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے ـــ

'' آیا رمضان آئے نمازی رمضان کے''

کیا نظم واہ واہ۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔آمین۔''

دراصل فضلِ حق آزاد نے''رمضان'' کے عنوان سے دو نظمیں لکھی ہیں۔جس میں ایک طرف رمضان المبارک کے فضائل وبرکات کا ذکر ہے۔اللہ کی شانِ کریمی کا بیان ہے تو دوسری طرف قوم کے حالات کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔پہلی طویل نظم ۲۴ بندوں پر مشتمل ہے جو پہلے الپنچ ۳رفروری ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی اور دوسری چودہ اشعار پر مشتمل ہیں جسے الپنچ ۲۶رنومبر ۱۹۰۴ء میں دیکھا جاسکتا ہے تو مخزن، جلد ۱۰، شمارہ ۲ کے ص ۵۳۔۵۴ پر بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔دوسری نظم کا یہ شعر:

لو آگیا رمضان چھپے ہیں ساری رات

یہ دن پھرے ہیں کہ اب دن سے بھی ہے پیاری رات

جبکہ پہلی نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

مومنو شاد ہو ماہِ رمضاں آیا ہے
ہر طرف ذکر و عبادت کا سماں چھایا ہے
ان نصیبوں سے یہ اللہ نے دکھلایا ہے
نور ایمان سے پوچھے کوئی کیا پایا ہے
غلغلہ حمد کا اطباق سمادات میں ہے
عالم اک نور کا چھایا ہوا دن رات میں ہے

جبکہ گیارہ اشعار پر مشتمل ایک اور نظم ''ماہ صیام'' بھی ہے، جس کا پہلا شعر ملاحظہ ہو:

وصیت میں ماہِ صیام اے روزہ دار
دن کی گرمی، شب کی سردی خوشگوار

لیکن شومیٔ قسمت کہ اس تاج کے صرف سولہ (۱۶) شمارے ہی نکل سکے۔ دراصل ان نظموں کا ذکر یوں ضروری سمجھا گیا کہ میری رسائی آزاد کی رمضان سے متعلق جن نظموں تک ہوئی اس میں کہیں یہ مصرع '' آیا رمضان آئے نمازی رمضان کے'' میسر نہیں۔ ممکن ہے بعد کو آزاد نے یہ مصرع بدل دیا ہوگا۔ یوں تاج کے اس شمارے تک میری بھی رسائی نہیں ہوسکی ہے۔

پروفیسر عبدالمنان بیدل نے اخبار ''تاج'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اخبار تاج کہنے کو اخبار تھا۔ اس لیے کہ اس میں آج کل کی بہ نسبت خبریں بہت کم اور علمی اور ادبی مقالات بہت زیادہ ہوتے۔ اس اخبار میں آج سے پچاس برس پہلے جو مقالات اور مضامین لکھے گئے ہیں اب بھی ان کی افادیت اور دل کشی جوں کی توں باقی ہے۔ اس علمی اخبار میں اب بھی ایسے عنوانوں پر آپ کو مقالے ملیں گے اور نظمیں نظر آئیں گیں جن کی نظیر اس دورِ بسیار نویسی میں بھی نہ ملے گی۔ اگر ان مقالوں اور نظموں کو اکٹھا کیا جائے تو اصلاحی، اخلاقی، تاریخی، معاشی اور معاشرتی نظموں اور مقالوں کی کئی ضخیم کتابیں تیار ہوسکتی ہیں۔''

گویا فصلِ حق آزاد کی ادبی، ملّی خدمت کا سلسلہ طویل بھی ہے اور ہمہ جہت بھی جسے کسی طور صفحات کی قید

میں قید نہیں کیا جاسکتا۔

فصلِ حق آزاد نے جو مضامین لکھے ان کی ادبی حیثیت بھی مقدم ہے۔ یہ امر واقع ہے کہ آزاد ایک پختہ تخلیقی فن کار تھے اور کوئی بھی ادیب جب پختہ فن کار بن جاتا ہے تو کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے سے قبل یہ ضرور دیکھتا ہے کہ اس کے مطالبات اور مقتضیات کیا ہیں؟ وہ ایک ہی لاٹھی سے تمام موضوعات کو نہیں ہانکتا۔ وہ اصنافِ وموضوعات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور اقتضا ومطالبات کے پیش نظر اپنے قلم کو جنبش دیتا ہے۔ حسب ضرورت لفظیات ومصطلحات اور تلازمات وعلامات واضح کرتا ہے۔ یہ اس کا بنیادی وصف ہوتا ہے اور اس کے اسلوب کی زندہ علامت بھی جو اس کی شناخت کا موجب بن جاتی ہے اس لیے تہہ در تہہ اور پہلو بہ پہلو ہونے کے باوجود بھی ایک ایسا بنیادی اور مرکزی نقطہ ضرور ہوتا ہے جس پر اس کی تمام جہتیں ارتکاز کرتی ہیں اور منحصر ہوتی ہیں اور امتیاز وانفراد کی راہیں ہموار کردیتی ہیں۔ علامہ آزاد، سرسید، حالی اور شبلی کی تحریک سے متاثر ہی نہ تھے بلکہ اس تحریک کا حصہ بھی تھے۔ چنانچہ اس تحریک نے شعروادب کو جس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اس کا اثر آزاد پر بھلا کیوں نہ ہوتا ملاحظہ ہو آزاد کے اخبار ہی سے چند اقتباسات:

''جب تک اپنی حقیقت سے بے خبری ہے، خواہشات نفسانی کو ترقی ہے، اپنی حقیقت منکشف ہوئی اور اعتدال آیا... وہ عیش کے بندے جو شب وروز نشۂ عیش میں چور، غفلت وسرشاری کے مزے لے رہے ہیں اگر سمجھیں کہ وہ اور ان کا عیش فناپذیر ہے تو ان کو ضرور کسی جاوید زندگی کی تلاش ہوگی۔ کیا ممکن ہے کہ ایک وجود فانی بقائے ابدی حاصل کرسکے؟ مادۂ فناپذیر کی خود کیا طاقت کہ وہ اٹھ کھڑا ہو اور جامۂ ہستی پہن لے۔ ہم جو فناپذیر مادے کو متشکل دیکھتے ہیں تو کیوں؟ ان کو اٹھا کر کھڑا کرنے والی اک اور قوت ہے کہ وہ ابدی ہے اور اصل وہی ہے۔ یہ مادۂ متشکل اس کا ایک پیراہن ہے۔ جب وہ اک پیراہن سے دوسرے پیراہن میں آجاتی ہے تو حیات وموت کے معنی منکشف ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح انسان اگر اس قوت کو نشوونما دے اور اس کی نشوونما عمدہ صفات، پاکیزہ اخلاق اور حسنِ عمل سے ہے تو اس طرح انسان حیات جاوید کے سرچشمے تک پہنچ سکتا ہے۔''

یہاں آزاد قوم کی اس غفلت پر طنز کرتے ہیں جس نے دنیائے فانی کو عیش پرستی کے لیے منتخب کرلیا اور پھر ''عقل وعقیدہ'' عنوان کے تحت اپنے معاشرے کے سامنے آئینہ اس طرح رکھتے ہیں کہ:

''نظارۂ عالم اور تجربات زندگی سے جو احکام نفی و اثبات، جلب و سلب، رغبت و نفرت بھی حاصل ہیں، ان کی بنا بالضرور کسی ایسے اصول پر ہے کہ اگر اس سے انکار کیا جاوے تو لاجرم، ایسے اقرار کا انکار لازم آئے جس کی بنا کسی مشاہدہ حسی پر ہو، مثلاً کسی نے کہا: آدمی مر کر مٹّی میں مل جاتا ہے یعنی مٹی ہو جاتا ہے۔ اگر اس سے انکار کیا جائے تو اتنے اقرار سے انکار لازم آئے گا جس کی بنا مشاہدات حسّی پر ہے۔ آدمی جاندار جسم ہے ۔جس سے جان نکلتی ہے تو جسم بے جان گل کر سڑ کر مٹی میں مل جاتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آدمی گل سڑ کر مٹّی ہو۔ تو اس قسم کے احکام کو عقلیہ کہتے ہیں...... لیکن مشاہدات محدود ہیں اور حالات و خواہشات لامحدود اس لئے ہر محل میں احکام عقلیہ نہیں چل سکتے اور ہمیں ضرورت ہے کہ ان سے پرے اور احکامات کی تفتیش کریں.... حق بین اور اولوالعزم بندگان خدا تو احکام عقلیہ سے آگے چل کر ایسے اصول اخلاق قائم کرنا پڑتے ہیں جن کی بنا ایسے مسلمات پر ہے کہ ان کے انکار سے خود وہ اصول اخلاق لغو محض ہو جاتے ہیں اور بنا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ مثلاً جس وقت یہ کہا گیا کہ جو خدائی راہ میں مارا جائے گا وہ شہید ہے۔ اس کو مردہ نہ کہو، وہ ہمیشہ زندہ ہے تو ضرور خدا اور خدا کی راہ مسلم ہے۔ اگر اس سے انکار کیا جائے تو نعوذ باللہ منہا، خدا کی راہ میں مرنے کا اصول ہی باطل ٹھہرا۔ اب کس کی جان بھاری پڑی ہے کہ مفت جان دینے جائے گا۔ پھر ایسی دنیا جس کا نمونہ قرون اولیٰ میں پایا جاتا ہے، دنیا میں پایا جانا محال ہوگا اور اس سے زیادہ اخلاقی نقصان اور کیا ہوسکتا ہے ۔ تو ایسے احکام جن کی بنا ایسے اصول پر ہو احکام معتقدات ہیں اور حاکم عقائد جن کا محل دل ہے۔ دل جہاں خوف و رجا، درد و غم، حزن و فرح نے شمع ایمان جلا رکھی ہے۔''[۱]

ان دونوں اقتباسات سے یہ واضح ہے کہ آزاد نے انشائیے بھی لکھے ہیں کیونکہ یہاں ان کی تحریروں میں خیال و پیرایۂ خیال کی پر لطف تازہ کاری کا مظاہرہ جس طرح دکھائی دیتا ہے وہ انشائیہ نگار ہی کی خوبیاں ہیں۔

آزاد کا شعورِ نقد

شعور تنقید ایک عطیہ فطرت ہے جو کم و بیش تمام ذی ہوش و ذی شعور کے اندر موجود ہوتا ہے۔ عام زندگی کے معاملات و معمولات میں بھی یہی شعورِ تنقید ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اسی کے اشتراک و تعاون سے اخذ و انتخاب کے مرحلے طے کیے جاتے ہیں۔ پسند و ناپسند میں خط تقسیم بھی شعور تنقید ہی کھینچتا ہے اور حسن و قبح، خیر و شر اور نیک و بد کا امتیاز بھی تنقیدی شعور ہی قائم کرتا ہے۔ گویا یہ ایسی قوت ہے جس کی کارفرمائی سے انسانی زندگی اپنا معیار متعین کرتی ہے۔ شعر و ادب میں بھی اسی قوت کے کارکردگی سے استفادہ کر کے اسے وسیع مایہ بنایا جاتا ہے کیونکہ انتخاب تجزیہ سے لے کر انتخاب الفاظ اور تشکیل ہیئت تک کے مرحلے ادیب و شاعر، اپنے اپنے تنقیدی احساس کے وسیلے سے طے کرتے ہیں۔ گویا تنقید کی روشنی تخلیقی تجربات کو سنوارتی، سجاتی، نکھارتی اور اجالتی بھی ہے۔ تنقید نہ ہو تو تخلیقی تجربات ممکن ہی نہیں۔ یعنی ادبی تجربات کی تراش و خراش اور تزئین و آرائش کی پشت پر شاعر اور ادیب کی ناقدانہ بصیرت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جناب فضل حق آزاد کو اسی شعور تنقید نے بلند پایہ غزل گو، قادر الکلام قصیدہ نویس، فصیح غنائیہ شاعر، تنقید نگار، قطعہ تراش و رباعی ساز بنایا ہے۔ ان کی نظموں میں جو گونا گوں خیالات کو شرح و بسط اور چابکدستی میسر ہے وہ بھی اسی شعور تنقید کی وجہ سے ہے لیکن جن خیالات کی تفہیم کسی سبب سے شعری اسلوب میں ڈھلنے سے رہ گئے اسے آزاد نے مضامین کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ ان کے یہ مضامین ان کے پندرہ روزہ، تاج، کے علاوہ ماہنامہ ''مخزن'' علی گڑھ میگزین، ادیب زمیندار جیسے رسائل میں بکھرے پڑے ہیں بلکہ اس عہد کے تمام نمائندہ رسائل اور اخبارات میں آزاد کثرت سے شائع ہوتے تھے۔ تو آیئے سب سے پہلے زبان اور قاعدے کے تعلق سے آزاد کا یہ خیال ملاحظہ فرمائیں۔

[۱] بحوالہ مطالعۂ آزاد، ص ۳۹۔۴۰

’’جب یہ سوال کیا جائے کہ شاعری مقدم ہے، یا قواعد شاعری، تو جواب میں ہوگا
کہ شاعری اور ظاہر ہے کہ کوئی فن ہو، جب تک اس کے اجزاء کثرت وقوع میں
نہ آئیں۔ اس فن کا قاعدہ کیا بن سکتا ہے۔ .....جو قاعدے منضبط کئے گئے، کیا
ان کا ماخذ کلام اساتذہ کے سوا اور کچھ تھا... یہ چیز ٹوٹے پھوٹے قاعدے کیا، کسی
طرح انہیں صدمہ پہنچا سکتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ کیونکہ اگر وہ ان کے مطابق
نہیں ہیں تو وہ خود غلط ہیں‘‘[1]

یہ سچ ہے کہ پہلے فن پارہ وجود میں آیا پھر رفتہ رفتہ اس کے قواعد پر غور کیا جانے لگا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے تحقیق کے بعد وسائل تحقیق کا وجود عمل میں آیا۔ آزاد بنیادی طور پر جدید شاعری کے پیرو تھے جس کی بنیاد حالی نے ڈالی تھی اسی لیے جدید شاعری سے متعلق ان کا بیان ہے کہ:

’’ہندوستان جو مغربی خیالات اور مغربی شاعری کے انداز پر اٹھتا جاتا ہے اور دن
بہ دن یہاں کی طبیعتیں اسی رنگ کی شاعری میں ڈوبتی جاتی ہیں۔ کیا کسی کا قلم
انہیں روک سکتا ہے۔ یا کوئی ژولیدہ آرٹیکل اسے دبا سکتا ہے وہ لوگ جو زمانے کا
رخ پہچانتے ہیں۔ انہی کا قلم اس مضمون کی قدر کر سکتا ہے۔ پرانی روش پر مٹنے
والے اس کی قدر کیا جانیں۔ آج حالی کی شاعری بُری لگتی ہے۔ کل دیکھنا کہ ان کا
کلام سنہرے حرفوں اور سنہری جلدوں میں ہوگا۔
ناسخ و آتش کے زمانے کی سی شاعری خواب و خیال میں بھی نہ ہوگی۔ عمدہ شاعری
وہ ہے جس میں مضامین عمدہ ہوں۔ پھر سنجیدہ قوافی اور متین صفتوں سے انہیں
آراستہ کرو۔ یہ ان کی زینت ہے۔ کھوسٹ اور غیر مہذب مضامین میں عمدہ قافیے
آئے ہیں۔ تو کیا ہوا.... جن کو نظم طبیعی خداداد حاصل ہے۔ ان کی زبان سے جو
کچھ نکل جائے وہ سند ہے۔ اور ایسوں کی زبان سے ایسا ہی کلام نکلتا ہے جو سند
کے قابل ہوگا۔ کیونکہ خود نظم طبیعی بہت بڑی استاد ہے، وہ انہیں بے راہ نہیں

۱ بحوالہ مطالعۂ آزاد، ص ۴۰۔۴۱

ہونے دیتی۔ اساتذہ کے کلام پر جب غور کی نظر پڑتی ہے، تو ان آزاد طبیعتوں کا
حال کھلتا ہے۔ بتاؤ تو صحیح مضامین کے مقابلے میں قواعد کی پابندیوں کا خیال کسی
نے بھی کیا ہے۔ ہزاروں تصرفات موجود ہیں جن پر آج ہنگامے برپا ہوسکتے
ہیں۔ پھر یہ ساری خوبیاں طبیعتوں کی انہی آزادیوں کے سبب تھیں لیکن آتے
آتے جب نظم کی بنیاد چند قواعد پر ٹھہر گئی اور ان کا وسیلۂ دائرہ تنگ کر دیا، تو اس
شفاف چشمے کا بہتا ہوا پانی بھی ان جھاڑیوں میں رُک رُک کر بہنے لگا اور اس کے
ساتھ ہی وہ صاف طبیعتیں بھی مکدّر ہوگئیں۔ پھر نظم کی وہ اصل خوبیاں بھی جن کا
مرقع انسان کو عالم تصویر بنا دیتا تھا، باقی نہ رہی۔ استعارات کے پیچ در پیچ
سلسلوں اور قواعد کی سخت بندشوں نے ہم کو ایسا جکڑا کہ اس محدود دائرے سے
قدم باہر نہ نکل سکے۔ عمر بھر چلے۔ لیکن جہاں تھے وہیں رہے پھر بھی وہ تیز قدم کی
طبیعتیں مناسبتِ نظم کے قدرتی سرمائے سے مالا مال تھیں، نہ رُکے پر نہ رُکے‘‘[1]

آزاد دراصل اصلاحی تحریک سے متاثر ہی نہ تھے اسے لبیک کہنے والوں میں تھے۔ اس کے معاون تھے اس لیے حالی کے نظریے شاعری کے مداح بھی تھے اور انہیں اس بات کا احساس شدید تھا کہ نظم نگاری جذبے اور فکر کی تہہ در تہہ کیفیات کو سامنے لانے کا عمل ہے۔ اس لیے قواعد کی پابندی اس کی معنوی وسعت کو کم کرنے کی کوشش ہے۔ آزاد کے نزدیک اصول تخلیق فن یا ضابطۂ تحلیل فن پیوند کارانہ طور پر ایک Unit یا وحدت کی شکل میں ہے اور اس وحدت یا کلیت کو توڑ کر کسی اضافی اصول یا ضابطے کو اس پر منطبق کرنے کو قبول نہیں کرتے۔ آزاد فن کے تجریدی تصورات کو بدرجۂ اتم دیکھنے کی سفارش ہی نہیں کرتے بلکہ اس میں کافی دلچسپی لیتے ہیں:

’’جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آئینے کے سامنے جو صورت آتی ہے، منعکس ہو جاتی
ہے، اسی طرح جو آنکھوں سے دیکھتے، کانوں سے سنتے، ناک سے سونگھتے، زبان
سے چکھتے اور ہاتھ سے چھوتے ہیں اس کا پَرتو دماغ پر پڑ جاتا ہے۔ .....کتنی

۱ بحوالہ مطالعۂ آزاد، ص ۴۱

کا پیاں جمیں اور جمتی چلی جاتی ہے.... جب دماغ سے اجسام تک محسوسات کی الکٹریسیٹی کا تار بندھ جاتا ہے تو دماغ میں ایک روشنی پہنچ جاتی ہے جس کا نام ادراک یا انکشاف ہے۔ جب ہم اپنے تدرکات ومحسوسات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دماغی محافظ خانے کی سیر کرتے ہیں تو اس کا نام خیال کرنا ہے۔'' [1]

آزاد کا مطالعہ ومشاہدہ چونکہ کافی وقیع ہے اس لیے ان کے افکار وخیالات میں نت نئے سوالات اٹھتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اپنے مضمون ''قوت دماغی'' پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''قوت دماغی سے وہ دماغی قوت مراد نہیں ہے جس کو افعال اعصاب اور انتظام بدن میں دخل ہے۔ کیونکہ یہ تو حیوانوں میں انسانوں سے زیادہ ہے بلکہ دماغ کی وہ طاقت مراد ہے جو احساس حواس خمسہ کی جانچ پڑتال، چھان بین ٹھیک کرتی اور اس سے جو خیالات پیدا ہوتے ہیں، ان کو منظّم کرتی ہے۔ ان سے ایک نتیجہ نکالتی اور ان کو زبان یا قلم کے حوالے کرتی ہے۔ اس طرح کہ زبان وقلم سے ٹھیک وہی باتیں ادا ہوں جو اس کے مافی الذہن میں ہیں لیکن ہم کو بہت کم اتفاق ہوا ہے کہ ہمارے زبان وقلم سے ٹھیک ٹھیک وہی مضمون اور بعینہ وہی خیال ادا ہوئے جو ہمارے دماغ میں ہوں۔'' [1]

اور ''لطف کلام'' عنوان کے تحت روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''لطف کلام تو یہ ہے کہ سنتے ہی کانوں سے دل تک اتر جائے.... پھر تمام جسم میں بجلی کی طرح پھیل جائے، نہ یہ کہ کانوں سے دل تک اترتے اترتے گھنٹوں کا وقفہ ہو اور دماغ کو پہاڑ کی چڑھائی چڑھنا پڑے۔'' [2]

گویا آزاد کلام میں اسی جدت وقدامت اور روایت کے علمبردار ہیں جو حالی اور شبلی سے چلی آتی ہے۔

۱ پندرہ روزہ ''تاج''، فضلِ حق آزاد، ۱۵ر ستمبر ۱۹۰۲ء، ص۴

آزاد نے میر تقی میر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''حقیقتاً جو دل ودماغ، رنگ وبو، طینت وطبیعت میر صاحب ساتھ لائے تھے اس میں اور کسی کی شرکت نہ تھی ورنہ قابلیت کے لوگ تو کل بھی میر سے بڑھ کر تھے اور آج بھی نکلیں گے، لیکن صرف قابلیت سے کوئی شاعر میر تقی میر یا میر درد نہیں ہوسکتا۔ فن شاعری ولوازمات شاعری کے علاوہ شاعر کو خود اپنی خوبو، طبیعت وطینت، دل ودماغ پر نظر چاہئے۔ میر صاحب کا ہر شعر اپنے معنی کے علاوہ ایک عالم رکھتا ہے جس کو ان کی ذات، مقام ومراتب اور ان کے زمانے کے حالات سے ایسا تعلق ہے جو شبیہ کو اپنی صورت سے ہوتا ہے۔'' [3]

یعنی آزاد فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت فنکار کے تاریخی، تہذیبی اور سیاسی ومعاشرتی احوال وکوائف کو نظر میں رکھنا ضروری سمجھتے ہیں اور اسے وہ پس منظر کے طور پر منعکس دیکھنا چاہئے۔

جناب آزاد نے اپنے عہد کے شعراء پر بھی تنقید کی ہے اور خوب خوب کی ہے تو آیئے پہلے شوق نیموی پر آزاد کی رائے ملاحظہ ہو۔ یہ رائے شوق نیموی کے صرف دو اشعار پر مبنی ہے۔

(۱) قیامت خیز چشم فتنہ انگیز
شراب ناز روح افزا سے لبریم

آنکھیں مست ہوتی ہیں، شوخ ہوتی ہیں، شرگیں ہوتی ہیں، بیمار ہوتی ہیں۔ چشم نازنین تو نئی اُپج ہے اور ناز روح افزا سے لبریز ہو کر آنکھیں فتنہ انگیز تو تھیں ہی قیامت خیز کس طرح ہوئیں، ساغر بنی نہیں لبریز کس طرح ہوئیں۔ خدا کے بندے یوں کہنا چاہئے تھا۔

قیامت خیز چشم فتنہ انگیز
نگاہ ناز خنجر سے سوا تیز

(۲) نقاط خال عارض پیارے پیارے

۱ ''تاج''، بانکی پور، ۲۴ر نومبر ۱۹۰۲ء، ص۲

پری کی پتلیاں آنکھوں کے تارے

آنکھوں کی پتلی البتہ ہوتی، پری کی پتلی کو وہ قاف سے اڑا لائے اور محاورہ کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ یوں ہوتا تو کیا برا تھا محاورہ کی جان تو بچ جاتی۔

نقاط خال عارض پیارے پیارے
سواد چشم ان آنکھوں کے تارے[1]

یہ دراصل آزاد اور شوق نیموی کے ان معرکوں کا حصہ ہے جس سے الپنچ کے صفحات بھرے پڑے ہیں اور جس کی مثالوں کے لیے صفحات درکار ہیں۔ آزاد کے معرکے شاد سے بھی خوب خوب چلے۔ خصوصاً شاد کی تصنیف ''نوائے وطن (۱۸۸۴ء)'' پر الپنچ میں اس طرح محاذ آرائی ہوئی کہ شاد عظیم آبادی کی علمیت اور تحقیقی وتنقیدی نیز تخلیقی صلاحیتوں کو برسوں طنز وتضحیک اور حقارت کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن ان معرکوں کی پوری فائل اگر سامنے رکھ کر تجزیہ کیا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ فضل حق آزاد شاید ڈنڈے کے زور پر اپنی زبان دانی کا سکہ رائج کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے نثر اور شاعری دونوں ہی کا سہارا لیا تھا۔ شاعری میں انہوں نے جو ہجو کی وہ پہلا چانٹا، دوسرا چانٹا، تیسرا چانٹا اور چوتھا چانٹا جیسے عنوانات سے شائع ہوتے رہے ہر چند کہ شاد عظیم آبادی فضل حق آزاد کی علمی وادبی صلاحیت کا اعتراف ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا احترام بھی کرتے تھے اور اکثر مشاعروں میں دونوں بغل گیر بھی ہوتے۔ اور سرگوشیاں بھی ہوتی تھیں۔ بقول سید بدرالدین احمد:

''جب یہ (آزاد) پٹنہ آتے تو حضرت شاد کے یہاں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے۔ اس وقت کی ان دونوں کی آپس میں ملاقات بھی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ خبر ہوئی کہ حضرت فضل حق آزاد آئے ہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت شاد بے تابانہ ان کی طرف بڑھتے۔ معانقہ ہوتا اس کے بعد حضرت شاد اپنے مہمان کو لئے ہوئے اپنے خاص کمرے میں پہنچ جاتے جہاں شعر وشاعری سے زیادہ گزرے ہوئے زمانے کا تذکرہ چھڑتا،.....مشاعرہ ختم ہونے کے قریب

۱؎ بحوالہ سراج ومنہاج، پروفیسر اختر اورینوی، ایوان اُردو، پٹنہ، ۱۹۶۴ء، ص ۳۱۹

دونوں کمرے سے نکلتے۔ حضرت شاد کا اصرار ہوتا کہ حضرت آزاد آخر میں غزل پڑھیں اور یہ حضرت شاد کے آخر میں پڑھنے پر مصر رہتے۔''[1]

فضل حق آزاد نے اساتذہ فن کا جس طرح مذاق اُڑایا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزاد الفاظ کو Living Orgamism نہیں مانتے جبکہ ہمارے نزدیک الفاظ کی حیثیت بھی Living Organism کی ہے جو کثیر الجہات سیال واقعے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طور کوئی بھی علامت یا عبارت یک رخی نہیں ہوتی اور اعلیٰ ادب علامتیں وضع کرتا ہے۔ علامت کے وضع کرنے کا عمل تجربے کے مقتضیات اور مطالبات پر منحصر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں تخلیقی عمل کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ تخلیقی عمل کا سمجھنا کہنے کو آسان لیکن دراصل بہت ہی مشکل ہے۔ تجربہ، اظہار اور ترسیل کے بعد تعبیر وتفہیم کا مرحلہ آتا ہے۔ صاحب تجربہ جب اپنے تجربے کو بیان کرتا ہے یا ظاہر کرتا ہے تو یہ کام خود اس کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا، کیونکہ دونوں مرحلوں کے درمیان ایک زمانی بعُد بھی حائل ہوتا ہے۔ اس طرح تجربے کی اوریجنل ظہور پذیری بے کم وکاست علامتوں کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ کسی ناقد یا قاری کے لیے ان علامتوں کا سمجھنا ایک لازمی شرط ہے۔

سید احمد اللہ ندوی مولف تذکرہ مسلم شعرائے بہار نے بھی آزاد اور شاد کے معرکوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''عہد شباب میں علامہ آزاد کو علامہ شاد عظیم آبادی سے معاصرانہ چشمک ہوگئی تھی۔ دونوں میں خوب نوک جھونک کی چلی، بانکی پور، پٹنہ کا ہفتہ وار اخبار الپنچ اس علمی جنگ کے لئے وقف ہوگیا تھا۔ ہر ایک نے اپنا اپنا معاون گروہ بنالیا تھا جس کی زبانِ قلم نوک سنان کا کام کرنے لگی تھی۔ ان دو گروہوں کی علمی جنگ نے صوبہ بہار میں اردو ادب کو بہت فروغ دیا۔ اردو اور فارسی کے محاورے، استعارے اور کنائے نئی بندشیں اور ترکیبیں صوبہ بہار کے عوام مسلمانوں کے کانوں تک پہنچ گئیں اور پھر ان کے گوشۂ دل تک اُتر گئیں۔ اگر چہ ان دو گروہوں کے دلوں

۱؎ بحوالہ سراج ومنہاج، ص ۳۲۰۔۳۲۲

میں مخالفت کا غبار ضرور پیدا ہوگیا تھا۔مگر جب ان دونوں علامہ بزرگوں کا عہد پیری آیا تو غبار خاطر دلوں سے اُتر گیا۔''[1]

علامہ آزاد کے معرکے علامہ اقبال سے بھی ہوئے اور خوب خوب چلے جس کی ابتداء رسالہ معارف ،اعظم گڑھ، سے ہوئی اور پھر ''زمیندار'' لاہور، میں مسلسل مرکوز ہوگئی۔دراصل آزاد کو اقبال کے سیاسی نقطۂ نظر سے اختلاف تھا چنانچہ اقبال کی غزلوں اور نظموں کے جواب میں آزاد بے دریغ لکھنے لگے اور دونوں ایک دوسرے کے کلام میں اصطلاحات وتشبیہات کے علاوہ عروضی استعمال پر بھی کھل کر بحث کرنے لگے۔خیر کہ اس معرکہ کو پروفیسر شیرانی نے سنبھال لیا اور ''زمیندار'' میں بڑھنے والے معرکے کو سکون میسر آیا۔

[1] مضمون تاثیر خیال،''تاج''،۲۳؍ستمبر۱۹۰۲ء ص ٦

آزاد کی نثر نگاری

علامہ فضل حق آزاد کی تبحر علمی کا ذکر گذشتہ ابواب میں کیا جاچکا ہے۔ان کی نثری تحریروں کا ذکر بھی، جو مضامین کی شکل میں میسر آئے ، سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ یہاں علامہ آزاد کی وہ تحریریں شامل کی جارہی ہیں جسے لکھنے کے لیے زندگی کا احترام ضروری ہے اور جس میں شخصیت ،مختلف شکلوں میں نہ صرف یہ کہ جلوہ گر ہوتی ہے بلکہ اپنے عہد، ذاتی نشونما، امیدوں، کاوشوں اور حسرتوں کا اشاریہ بھی بن جاتی ہے میری مراد ہے خطوط نگاری سے، جسے عہد غالب نے ایک صنف نثر کا درجہ عطا کیا ہے۔ ہائے افسوس کہ اکیسویں صدی کی نئی تکنیک نے ہماری ہی نسل کو اس صنف نثر سے دور کردیا۔آنے والی نسلیں کب اس صنف نثر سے روبرو ہوں گی۔سب سے پہلے علامہ آزاد کے وہ نجی خطوط ملاحظہ ہوں جن میں رنگارنگی ،تنوع اور عمومیت جیسی وہ کیفیات میسر ہوں گی جو فن خطوط نگاری کا تقاضا ہوا کرتی ہیں۔دراصل سید احمد اللہ ندوی مولف ''تذکرہ شعراء بہار'' کو جب محکمہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد، دکن کی ملازمت کے دوران تذکرہ لکھنے کی فکر ہوئی اور بہار کے ادباء وشعراء سے رابطہ کا واحد ذریعہ خطوط ہی تھے تبھی علامہ آزاد کے خطوط ان نے جمع کیے اور تین طویل خطوط کو اپنے تذکرہ میں جمع کردیا۔صرف اس لیے کہ یہاں کئی تاریخی حقائق سے مطالعہ آزاد میں مدد مل سکے:

(۱) **مرکز دائرۃ المعارف، حیدرآباد:** دکن، گل سرسبدِ بوستاں ، وطن خضر، مسلک آزادروی، مولوی احمد اللہ صاحب ندوی متع اللہ المسلمین بطول حیاتکم ومتاع افاداتکم ۔سرمایہ وحیات ہے افسانۂ حیات لیکن ؎

انّی[۸۰] کے قریب عمر ہوگی آزاد — کیا کیا کہیئے کہ اس میں کیا کیا گزری
جب نہ کھچے اگلے دنوں کا نقشہ — بیجا نظر آئے گی جو ہر جا گزری

القصّہ مجکو اپنے سوانح حیات اک بحر زخار کی شکل میں ناپیدا کنار وممتنع العبور نظر آرہے ہیں اور بغیر خضرِ طریق ناممکن ہے کہ میں اپنی کاغذی ناؤ کے سہارے آغاز کو ساحلِ انجام تک پہنچانے میں کامیابی

[1] قوت دماغی ''تاج''،۲۳؍ستمبر۱۹۰۲ء،ص۲۔ [2] لطف کلام ''تاج''،۸؍دسمبر۱۹۰۲ء،ص۲۔ [3] ایضاً ص۳

کی امید کرسکوں ۔ ہاں میں لکھتا لکھواتا جاؤں اور بتاتا جاؤں آپ سونچتے سمجھتے اور حُسنِ قبول کا جامہ پہناتے چلے جائیں تو جو پھول اس طرح گوندھے جائیں گے وہ سر کیوں نہ چڑھیں گے۔ بمنزل می رسد ہر شب گام آہستہ آہستہ۔ منزل مقصود تک پہنچنے کی یہی ایک صورت ہے اور بس۔

دائرۃ المعارف کے حلقے سے آپ کا نکلنا مشکل، میں کہ اپنے وطن دوستوں اور ہمعصر اقارب کو کھوکر تنہا زندگی کے دن گزار رہا ہوں، چہ حظ برد خضر از عمرِ جاوداں تنہا، میرے پیشِ نظر ہے، اور اکثر بامذاق احباب حیدر آباد ہی میں مجکو ملیں گے۔ آپ سے ملنے کا احرام باندھ سکتا ہوں، ایک ہی شرط ہے کہ اچھے کوارٹر میں ایک اچھے مکان کا حصہ مجکو مل جائے، جہاں صحت کے ساتھ کچھ گزار سکوں، جب تک ممکن ہو اس کی دستیابی شرط لابدی ہے، باقی خیر والسلام، طالب خیر، فضلِ حق۔

(۲) ۲۶ /جنوری، آزاد منزل شاہو بگہہ، ضلع گیا: اعزواجب الیق. اشفق زیدت اخلاصکم والطافکم، ۲۵ /جنوری کا رقیمہ جن مستفسرہ امور کو شامل ہے ان کے جواب کے بعد اس خط کو آخری خط تصور فرمانا چاہئے۔ اک حقیقت ضروری الاظہار یہ بھی ہے کہ جب مجکو غُفران مآب قاضی سید رضا حسین مربی قوم مجکو میرے ابّا علیہ الرحمۃ سے چھین کر عظیم آباد لے گئے اور میرے ساتھ طلبۂ قرابتمند کا ایک گروہ شامل کیا گیا۔ میں ہدایۃ النحو پڑھتا تھا، مفعول مطلق کا بیان پڑھ چکا تھا، میرے استاد رخصت میں تھے، حافظ قرآن ہو چکنے کے کئی سال ہو گئے تھے، مدرسہ میں داخل ہوا، صرف کا ایک کلاس مجکو سپرد ہوا۔ میں پڑھاتا بھی تھا پڑھتا بھی تھا۔ مدرسہ اس وقت بہت ابتدائی حالت میں اور چندوں پر چلتا تھا جس میں میری شرکت بھی تھی، یعنی ابّا مرحوم کی، رفتہ رفتہ ترقی پذیر ہوکر لودی کٹرہ سے بنام مدرسہ ''عُجالہ نافعہ'' دوندی بازار حضرت مولانا امین اللہ صاحب علیہ الرحمۃ کی خانقاہ میں منتقل ہوکر اعلیٰ کلاسوں میں منتقل ہوا۔ مولانا کمال صاحب اس درسگاہ کے پرنسپل تھے، اب میں کافیہ شریفہ اور تہذیب پڑھتا تھا، ایک سال کے بعد مولانا کمال صاحب کی کلاس میں مولوی عبدالغنی مرحوم استھانوی جو قاضی صاحب مرحوم کے مکان میں قیام پذیر تھے، اور خانگی معلّمی کی حیثیت بھی حاصل تھی، مُلاّ جلال پڑھتے تھے، مطالعہ اور مباحثہ کی شہرت نے راقم کو گُدگُدایا، میری کلاس میں نورالانوار کا سبق ہوتا تھا اور وہ خود مولانا امین اللہ صاحب کے درس خاص میں تھا۔ میں نے حضرتنا قاضی سید رضا حسین صاحب سے استدعاء کی کہ یا تو مولانا کمال صاحب کی کلاس میں نورالانوار کی شرکت کے لئے سفارش کر دیجئے یا اجازت دیجئے کہ میں فرنگی محل چلا جاؤں ۔ حضرت علیہ

[1] فضل حق آزاد: عصر حیات اور فن، ڈاکٹر روحی حسن مجید، سائنٹفک پبلیشرز، پٹنہ۔ ۶، ۱۹۸۰ء، ص ۵۰

الرحمۃ کو صداقت ذوق کا وثوق تھا اور میری علیٰحدگی مدرسہ کے حق میں نقصان رساں بھی ہوسکتی تھی۔ مولانا کمال صاحب کا کلاس مل گیا، اور مولوی سید عبدالغنی استھانوی سے اور مجھ سے گھٹ گئی اور یارانہ پیدا ہوگیا۔ میری فارسی مدرسہ بھر پر غالب تھی، عرفی کے بعض بعض قصائد پر شعر بھی کچھ قلم سے نکلے ہوئے تھے، ہر طرف سے سوالوں کی بوچھاڑ رہتی تھی، غالب کے اشعار تھے اور میں، وہ آیا اس نے کہا حافظ! غالب نے یہ کیا کہا ہے؟ اس نے للکارا اس کو کیسے یہ کیا کہا ہے، قرآن خوانی اور قرأۃ، پھر شعر فہمی کی شہرت، زبان کا تڑاقا ان باتوں نے مل کر اک تماشا بنا دیا تھا۔ مولوی عبدالغنی صاحب کے دل میں میری محبت نے گھر کر لیا تھا اور مذاکرہ ومباحثہ سے فرصتِ مطالعہ کمتر نصیب ہونے لگی، مرحوم ومغفور چونکہ نہایت ہی عالی ظرف وبلند ہمت، راستباز دیار صادق تھے، خوبیوں کے ساتھ کمزوریوں پر بھی نگاہ پڑنے لگی اور مجکو چونکایا تو میں نے اس کو حِس کیا، اور قاضی صاحب سے اپیل کی، آپ کا حکم تھا کہ سوال مذہبی وغیر مذہبی جو دل میں خطور کرے بے تکلف ہم سے پوچھو، چنانچہ اس باب میں میں نے عرض کی، یا حضرت! نحو کی غایت وغرض تو صیانت ہے خطائے اعراب سے، میں نے آپ کے مدرسہ میں نحو پڑھی اور امتحان میں سو کے سو نمبر لایا۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ اوروں کی طرح یعنی مولوی عبدالغنی صاحب کی طرح عبارت پر قادر نہیں ہوں اور مجکو نہایت تعجب ہے کہ کوئی طالب علم کس طرح قواعد نحو سے متمتع حاصل کرے گا۔ جب وہ جان لے گا کہ فلاں لفظ جملے میں فاعل ہے اور فلاں مفعول تو مطلب منکشف ہوگیا، پھر طلب کیا باقی رہی؟ اور جب تک یہ نہیں معلوم ضمّہ اور فتحہ دینے پر حُجت کیا ہوگی یعنی قواعد نحو سے فاعل ومفعول ہونا کس طرح معلوم ہوگا اور جب یہ معلوم نہ ہوا تو صحت اعراب کی توقع کس بنا پر ہوگی، مسکرائے اور مولوی عبدالغنی صاحب کو طلب فرمایا اور یہ حکم صادر ہوا کہ ''فضل حق'' یعنی راقم کو نورالانوار کے اوراق اُکٹوائے اورر پٹوائے جائیں یعنی تیز تیز بلا خیال معنی پڑھوائے جائیں اور ضمّہ فتحہ واِنَّ واَنَّ کی تصحیح مدنظر رہے، واقف اسرار جامع الجوامع کا اشارہ میرے حق میں اکسیر ہوگیا، اور چند دنوں میں میں اس انداز پر قادر ہوگیا جس سے بہ استمداد قواعد بہ صحت عبارت خوانی کا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے، میں اپنے صادق ورہنما دوست سے فیضیاب صحت عبارت عربی وتصدیقات منطق ہوگیا اور میرا دوست میری صحبت سے فارسی ومذاق شاعری میں، عجب دلربا اتحاد ونادرالوقوع صحبت تھی، جس کا اثر دلوں سے مٹتے مٹتے نہ مٹا، پھر اس صحبت میں مولوی سید رحیم الدین اور منشی محمد اعظم بھی شامل ہوگئے جن کے شمول نے صحبت ومذاق محبت کو چار چاند لگا دیئے، جس عالم میں وہ عالم بسر ہوگیا ہے اس کے کیف کو

[1] حقیقت بھی کہانی بھی، سید بدرالدین احمد، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۲۰۰۳ء، ص ۵۵۸

مخدوم الملک و چرم پوش بہاری جیسے صاحب جذبات ہی سمجھ سکتے ہیں، علم وفلسفۂ مادیات اس کا محرم نہیں ہوسکتا، جب میں حیدرآباد دکن پہنچا اُدھر حالی وشبلی اور اِدھر حضرت غنی اور بندہ آزاد کیا کیا معرکے رہے ہیں، دل واندومن، شبلی نے اعتراض کیا پیارے بروزن ہمارے متروک ہے، اور حالی نے حامی بھری صبا تک تھا اب متروک ہے، میں نے میر کا مصرع پڑھا ہے پیارے دلّی دور، اور کہا میری زبان کو میر صاحب کی زبان سمجھئے، بس زیادہ فصاحت کی ضرورت نہیں ہے، اس توجیہ کوسُن کر حضرت غنی علیہ الرحمۃ ہنستے ہنستے لوٹ گئے، پھر شبلی کا ایک قطعہ یا قصیدہ فارسی تھا طبع شدہ، اس کے میں نے لتّے لئے اور چتھاڑ کر رکھ دیا، حضرت شبلی نے بھی بلا کا ذہن پایا تھا سمجھ گئے، تاویلات سے کام نہ چلے گا، ہات رکھ دیا اور فرمایا یہاں سے دیکھئے، وہاں سے صاف تھا اور جیسا چاہئے تھا تو میں نے کہا کاش آپ نے یہیں سے چھپوایا ہوتا، اس پر بھی ایک قہقہہ ہوگیا، علامہ حقیقی علم دوست تھے، پٹنے میں میرے مہمان ہوئے اور میرے شعر پڑھ کر مجکو سنائے اور اشاعت کلام کی بلیغ فرمائش کی، ان توجیہات کے ساتھ جو چیز جب ہوگئی ہوگئی، پھر ہات ملنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا، للہ درمن قال، واقعی خدالگتی کہی تھی، اب پچتاتا ہوں کہ خلاصہ ان ہذیانات کا یہ ہے کہ مولوی عبدالغنی صاحب کے فرزندار جمند مسٹر محی الدین وہیں حیدرآباد میں تشریف رکھتے ہیں، آپ اس طرح اُن کو خبردار کیجئے گا کہ وہ سمجھیں میں آپ کو اور اُن کو ایک ہی سمجھ کر آپ کا مہمان ہورہا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کے دل میں میرا احترام بہت زیادہ نظر آتا ہے جس سے ممکن ہے کہ یہ آداب وتکاف میزبان ومہمان دونوں کے لئے موجب کلفت ثابت ہو، اور کیا تعجب ہے آپ اس کی تصدیق فرمائیں۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ جب حیدرآباد دکن سید سرسید بانی کالج علی گڑھ کے ساتھ پہنچا تھا تو دوران قیام میں باورچی کا ہات بھی سلام کو نہیں اُٹھا تھا اور برجا تھا کہ اس کے زرّیں پر تلے اور جامعہ دار شروانی کا جواب ہم لوگوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔ قاضی صاحب (قاضی سید رضا حسین) نے وہاں پہنچ کر شروانی بنوائی تھی اور باقی لوگ جوں کے توں حاضر دربار ہوے تھے۔ ہائے وہ کیا سادہ پُر کار دربار خلفاء کے دربار خلافت کے مماثل تھا جس میں خُلد مقام جنت آرام گاہ حضرت محبوب علی خاں اپنی سادہ اور محض سادہ پوشاک میں اک گول کُرسی پر صدر میں جلوہ افروز تھے، سید مرحوم سے آنکھیں لڑی ہوئی تھیں اور جب تک ایڈرس تمام نہ ہوا آنکھیں لڑی ہی رہیں، بعد از اختتام شاہی کرسی اپنے جاہ وجلال کے ساتھ خالی نظر آئی اور خود بدولت بوڑھے سید کا احترام ادا کرتے ہوئے نظر آئے، وہ خاموش سماں اور بارعب سنّاٹا

۱ تذکرہ مسلم شعرائے بہار، حصہ اوّل، سید احمد اللہ ندوی، ۱۹۸۱ء ص ۵۴

تیرہ چودہ اعیان گداگران قوم کی نگاہ آزرد جہاں تک جاسکتی تھی پیچھے پیچھے گئی۔ مجمع برخاست ہوا، درباری گھر واپس آئے، ہاں جب میں نے نظم پڑھی اور بار بار پڑھوائی گئی تب کانوں میں صدا آئی، حافظ صاحب سلام علیک، باورچی صاحب سامنے آکر بعد از عرض سلام یوں سخن آرا ہوئے، حضور کا غلام بھی تا بعد ارکا فرزند علی گڑھ میں پڑھتا ہے۔ صدرالصدور صاحب کے صاحبزادے کے ساتھ، حاؔلی صاحب نے بھی نظم عنایت فرمائی ہے، آپ بھی عنایت فرمائیں تو مزید مہربانی، میں نے کہا، بھائی حاؔلی صاحب کی نظم چھپ گئی ہے اور میرے پاس تو وہی ایک نسخہ ہے، اور پھر حالی صاحب کی نظم کے بعد اس کی ضرورت ہی کیا ہے، بایں ہمہ چھپ جائے گی تو بھیجدوں گا، جب چھپ گئی تو پتہ دیا ہوا نہ تھا میں ہاتھ مل کر رہ گیا، اور خانساماں محروم۔

(۳) ۲۵/جولائی ۱۹۳۶ء

عزیزم وحبیب مکرم ادام اللہ بالبرکات والحسنان، سلام علیکم ورحمۃ اللہ علیکم

تمہاری یاد میں زندہ ہیں کیا جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔ یہ خنجر پھر رہے ہیں حلق پر یا دن گزرتے ہیں۔

وبائے طاعون نے حیدرآباد کا پیچھا چھوڑا، اور اب چاہوں کہ آؤں تو آسکتا ہوں یا اب بھی نہیں، ستمبر میں بھی جوبلی ہوگی یا نہیں، اور کب تک ہوگی۔ اگرچہ مجکو انتظار جوبلی کا نہیں ہے مگر اس کی رعایت مدنظر ہے والسلام۔

سید فضل حق آزاد، منزل شاہو بگہہ، ضلع گیا

ضمیمہ

شعرائے متاخرین میں بہار سے تعلق رکھنے والی پانچ اہم شخصیتیں گزری ہیں: ''شاد عظیم آبادی، فضل حق آزاد، صفیر بلگرامی، شوق نیموی، امداد امام اثر۔ ان میں شاد اور آزاد کا مقام زیادہ بلند تھا۔ لیکن آزاد کو آزاد کے زمانے کے بعد وہ شہرت میسر نہ آئی جو شاد کو حاصل رہی۔ یقیناً اس لیے کہ آزاد کا ادبی وشعری سرمایہ مجموعہ کی شکل میں شائع نہ ہو سکا اور بہت بڑا حصّہ ان کی حویلی ہی میں کرم خوردہ ہو گیا۔ شاد کو اپنی زبان دانی، جذبات نگاری اور تشبیہ واستعارہ، مجاز وکنایہ، رمز وایما، تصویریت وغنائیت، پیکر تراشی ومحاکات اور لب ولہجہ کے تیور کے استعمال پر جو ہنر میسر تھی اس پر جب انہیں ''انا'' ستانے لگی تو اپنی تصنیف ''نوائے وطن''، مطبوعہ ۱۸۸۴ء میں اپنے عقیدہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''مادری زبان کی فصاحت اگر ڈھونڈھنی ہو تو زیادہ تر دو قسم کے لوگوں میں ڈھونڈ ھو، شاہزادوں میں یا عالی خاندان امراء میں۔ پہلے طبقہ کے لوگ تو ہمارے صوبہ بہار میں نام کو نہیں، مگر دوسرے طبقے میں اب بھی کوئی نہ کوئی باقی ماندہ نکل آتا ہے۔ میں اپنے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ انہیں ایسے لوگوں میں صرف کیا ہے اور اکثر زبانوں کے الٹ پھیر پر غور کرتا رہتا ہوں۔''

شاد کے اس بیان سے ویسے تمام ادباء وشعراء برہم ہو گئے جو مضافات سے تعلق رکھتے تھے اور حق تو یہ ہے کہ شاد سے قبل، شاد کے عہد یا ان کے بعد شعر وادب کے معیار کو برقرار رکھنے، سنوارنے اور بین الاقوامی ادب سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ ویسے ہی لوگوں کی رہین منت تھی اور ہے۔ چنانچہ شاد پر ادبی معرکے شروع ہوئے آزاد چونکہ شاہو بگہہ (سابق گیا موجودہ جہان آباد) سے تعلق رکھتے۔ اس لیے انہوں نے اسے ذاتی سمجھ لیا اور شاد کے کلام وبیان کی خامیوں کو چن چن کر نکالنے لگے اور بانکی پور پٹنہ سے

شائع ہونے والا مشہور ہفت روزہ ''الپنچ''، جس کے ایڈیٹر مولوی سید رحیم الدین تھے، اس رزم آرائی کا اکھاڑا بنا رہا۔ بعد کو شاد نے معذرت طلب کی اور ایک مضمون ''اردوئے معلیٰ'' ۱۹۰۴ء میں شائع کرایا۔ یہ امر واقع ہے کہ عہد شاد میں سید فضل حق آزاد کو اردو فارسی اور عربی زبانوں کے برمحل استعمال پر جو قدرت حاصل تھی وہ کم کو ہی میسر تھا۔ اس لیے آزاد نے ان تمام اسالیب شاعری میں اپنی مضبوط موجودگی درج کرائی جس میں شاد نے طبع آزمائی کی۔ چنانچہ جب شاد نے مستزاد لکھی تو اس کے جواب میں آزاد نے بھی مستزاد لکھی۔

شاد کے دو مستزاد کی مختصر مثالیں ملاحظہ ہوں:

رُت پھری، ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کونپل ہو گئے پھول بھی پھل
اک یہ اُجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا اور سوکھا ہی کیا

———

کالی کالی وہ گھٹائیں وہ پپیہوں کی پکار دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یوں ہی رونے میں کٹا کیا کہیں چپ کے سوا

———

تو آزاد نے بھی مستزاد لکھی جس میں خوبصورت وپُر اثر جذبات نگاری کا بیان ہے۔

دراصل مستزاد عروض میں اس غزل کو کہتے ہیں جس کے ہر مصرع یا شعر کے بعد ایسا زائد ٹکڑا لگا ہو جو اسی مصرع کے رکن اوّل اور رکن آخر کے برابر ہو۔ اس کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔ مستزاد عارض اور مستزاد لازم۔ مستزاد عارض میں زیادہ کہا ہوا ٹکڑا مضمون شعر کا جزو نہیں ہوتا جبکہ مستزاد لازم میں زیادہ کہا ہوا ٹکڑا مضمون شعر کے مضمون سے پیوست ہوتا ہے۔ آزاد کی مستزاد بطور مثال ملاحظہ ہو:

مستزاد

کیا مجھ کو دکھائے گا کوئی اپنا تماشا کس کی ہے یہ طاقت
ہم لوگ بھی جب اپنا موافق تھا زمانہ رکھتے تھے طبیعت
پریوں کا اسی طرح یہاں بھی تھا جھمکڑا دن رات مزے تھے
صورت میں وہ حوروں سے بھی حد درجہ سوا تھے اور گرم تھی صحبت

رخساروں پر ڈالے ہوئے آنچل کا وہ پٹھا   اور ہاتھ کمر پر

اس دن سے وہ نقشہ میری آنکھوں میں ہے پھرتا   وحشت پہ ہے وحشت

سرخی وہ لبوں کی ہے اگر دیکھے تو چھٹ جائے   یاقوت کی رنگت

اس پر یہ مزا پان کا کھائے ہوئے بیڑا   آفت پہ تھی آفت

اس حسن خدا داد پہ وہ ہائے رے شوخی   چھل بل پہ شرارت

شیشے میں پری جیسے ہو ایسی تھی ہویدا   گھونگھٹ سے وہ صورت

ماتھے وہ افشاں کہ ارے ہائے کہوں کیا   چھلکے تھے ستارے

اور پھولوں سے لپٹا ہوا آفت کا وہ جوڑا   چوں صبح قیامت

وہ ناک میں بیسر کی قطب اپنی جگہ پر   چمکا کرے ہر دم

سیارہ تھا گویا کہ وہ جھومک کا ستارا   غارت گرے راحت

پاجامہ میں دو ہاتھ کی وہ گوٹ طرحدار   کھاتی ہوئی ٹھوکر

اور بڑھ کے دکھاتی ہوئی مہروں کا تماشا   ڈھاتی ہوئی آفت

ہاتھوں میں دیئے ہاتھ روش پر وہ ٹہلنا   ہونشہ میں بدمست

رہ رہ کے وہ انداز نیا سب کو دکھانا   ہو جس سے محبت

چھیڑے کوئی لیکن نہ شکن ماتھے پہ آئے   اور بلکہ وہ خوش ہوں

پرواہ نہیں اس کی کہ کرتا ہے کوئی کیا   اصلا نہ شکایت

ہے ہے وہ غضب جلسہ میں بے باک ٹہلنا   جو مار ہی ڈالے

یارو ہمیں سب یاد ہے وہ کھیل تماشا   سب پوری حکایت

آپس کا اتفاق

اے چھوٹی چھوٹی چونٹیو، اے ہستی ضعیف   دانہ کشِ نحیف

تم آگئیں کدھر سے مری کاپیوں کے پاس   بے خوف و بے ہراس

اک طعمۂ پتنگ کہ تھا لقمۂ لطیف   آ زوقۂ خفیف

بُو اُس کی کھینچ لائی تمہیں اے خرد شناس   بس ہے یہی قیاس

اللہ کیا ہجوم ہے کیا اژدہام و جوش   ہنگامۂ و خروش

اب اک طرف رواں ودواں جفت ہو کہ طاق   چالاک و چست و چاق

لائیں کشاں کشاں نہ ہوا کچھ بھی بارِ دوش   اللہ رے تیز ہوش

یہ بندوبست وسلسلہ ونظم وطمطراق

آپس کا اتفاق

نظارۂ حکمت

اے وہ کہ قصر تیرا، ایوانِ بادشاہی   جنت کا اک نمونہ

جس میں سجی ہوئی ہیں، از مرغ تا بہ ماہی   اشیائے گو نہ گو

تیرا لباس جس استر سے ہو مقرر   اک فنڈ کی اعانت

جو سال بھر نہ کھائے ، اک خاندان مل کر   تیرا وہ خوانِ دعوت

ایک ایک لفظ تیرا، اِک مملکت کی قسمت   کانِ زر و جواہر

تیری ہما ہمی سے ہیں غرق بحر حیرت   سب علم وفن کے ماہر

سچ کہہ کہ شوق تیرا بتلا کہ بھوک تیری   نشو ونما کے رہبر

کچھ کم بھی ہو چلے ہیں، کچھ ہو چلی ہے سیری   باہیں اسی روش پر

اک بات پوچھتا ہوں اوراس کی ہے ضرورت   آزردہ گر نہ ہو تو

دنیا میں جھوٹ کی ہے یا سچ کی ہے حکومت   یادونوں دست وبازو

اِنتخابِ کلام

غزل فارسی[1]

به من ایمامده از یاد وفا کوشی را — خود تدارک نه کنی وعده فراموشی را
نه سلامی نه پیامی نه جوابِ نامه — حق نگہداشتۂ خوب وفا کوشی را
نونیازان بہاراند کجا می دانند — شاخہای سمن آداب ہم آغوشی را
نرگس مَست کسی بین و بیک جانگر — بہم آمیختہ ہشیاری و بی ہوشی را
واعظا صحبتِ می درخور ہر کس نہ بود — ظرف پُر حوصلہ بایدمی ومی نوشی راہ
من ز سر بگذرم و تیغ تو از سر گزرد — چارۂ بہتر ازین نیست سبکدوشی را
عجبی نیست کہ سر چشمۂ حیوان یابد — خضر اگر سیر کند عالم مدہوشی را
ہمانہ رنجد ز زبون نالی بلبل دلِ گل — غیر ازین ہاسبی نیست گران گوشی را

منم آزاد و بہ آزادی خود می نازم
تار و پوداست زمن ذیل خط پوشی را

دریا کی طرح آنکھیں اُمڈیں کچھ دور جو وہ محبوب گیا — لب خشک ہوئے منہ زرد ہوا دل بیٹھ گیا جی ڈوب گیا
آنکھوں میں بہاریں ہیں اس کی دل سے غمِ محبوب گیا — وہ قطرۂ خوں دل ہے جس میں یہ لال سمندر ڈوب گیا
دن رات یہاں ہے آنکھوں سے ساون کی جھڑی بھادونکی بھرن — ابر آنکھیں لڑانے آیا تھا دیکھا تھا بہت مجحوب گیا
ساحل تک ابھی پہنچی بھی نہ تھی کشتی میری چشم گریاں کی — دریا نے ابھارا موجوں کو دامن سے دُرِ مطلوب گیا
وہ بات نہیں وہ آنکھ نہیں وہ ڈھنگ نہیں وہ طور نہیں — کیا ایک شباب آیا ظالم وہ اگلا سا اسلوب گیا
لکھ بھیجا ہوگا حال میرا دعوائے رقابت ہے جن کو — تھا کاتب کون میں کیا جانوں کس طرح میرا مکتوب گیا
کہتی ہیں بلائیں جانے دے کم صبر تیرا کس بات میں ہے — دنیا میں سلامت دم تیرا غم کیا ہے اگر ایوبؑ گیا
اس منزلِ کشورِ ہستی کا قانون نرالا سب سے ہے — جو راکب تھا مرکوب گیا جو غالب تھا مغلوب گیا

کیا نکہت گل کی سبک روی پر رشک سا مجھ کو آتا ہے
اس باغِ جہاں سے اے آزاد ہاں یوں جو گیا کیا خوب گیا

دیکھیں تو کیسے آنکھ سے جلوۂ یار دیکھ کر
دل کو فسردگی سی ہے باغ و بہار دیکھ کر

رنج بشر کو رنج پردے جو خدا تو دے مگر
دل کو جگر کو دیکھ کر صبر و قرار دیکھ کر

رند سے کیوں جھگڑتے ہیں شیخ ہوا سے لڑتے ہیں
پاؤں پھسل ہی پڑتے ہیں چلئے ہزار دیکھ کر

آنکھ سے آنکھ لڑ گئی مشکلِ چمن بگڑ گئی
پھولوں پر اوس پڑ گئی انکا نکھار دیکھ کر

حیف یہ شب یہ بیدلی اُف وہ شباب و بے خودی
اپنی خزاں بھی دیکھ لی اپنی بہار دیکھ کر

اس سے پیارا کوئی حبیب نہیں
اس سے بڑھ کر کوئی قریب نہیں

بے غمی ہے وہ گوہر نایاب
خوش نصیبوں کو بھی نصیب نہیں

نام ہی نام ہے طبیبوں کا
کوئی اس کے سوا طبیب نہیں

دوستوں کی نظر سے عیبوں پر
ادب آموز بھی ادیب نہیں

ماہِ کنعاں ہے مصر میں بھی عزیز
حسن غربت میں بھی غریب نہیں

بابِ توبہ نہ بند کر واعظ
کچھ قیامت ابھی قریب نہیں

پی بھی کمبخت سوچتا کیا ہے
ایسی جنت میں بھی نصیب نہیں

وہ باس نہ پھولوں میں نہ وہ رنگ چمن میں
کیا پھر گئی گلشن کی ہوا چشم زدن میں

رہ رہ کے ہر اک سمت سے اٹھتے ہیں بگولے
اب باد صبا خاک اُڑاتی ہے چمن میں

آبادیاں ویراں ہوئیں ویرانے ہیں آباد
فرق آ گیا کیا ہائے زمانے کے چلن میں

جوں طائرِ پر بند قفس میں ہیں تو پھر کیا
اے ہم نفسو لاکھ بہار آئے چمن میں

بس نالۂ آزادؔ تیری رام کہانی
حاشا نہ سنی جائے گی اس بزم سخن میں

سو طرف دھیان ہے کیا مشکل ہے
ضیق میں جان ہے کیا مشکل ہے

دل میں کعبہ ہے صنم آنکھوں میں
دوطرف دھیان ہے کیا مشکل

دل کو سمجھائے کہاں تک انسان
آخر انسان ہے کیا مشکل

کلمہ پڑھتے ہیں ہم اب اک بُت کا
کفر ایمان ہے کیا مشکل ہے

سمجھے تھے ہم کہ ہے مرنا مشکل
یہ بھی آسان ہے کیا مشکل ہے

نہ اب ہم چھوڑنے کے ہیں نہ وہ دونوں کو مشکل ہے
ہمارے ہاتھ میں ہے ہاتھ ان کے ہاتھ میں دل ہے

جہان مہر و الفت کی عیاں ہے موبہ مو حالت
جوابِ ساغر گیتی نما آئینۂ دل ہے

ہجومِ یاس سے دل میں سماں ہے بزم عشرت کا
چراغِ داغِ دل اپنا بجائے شمع محفل ہے

سراپا اپنی ہستی سے عیاں ہے جلوۂ قدرت
ہر اک ذرہ ہماری خاک کا خورشید منزل ہے

بہارِ عیش ہے شب بھر کی مہماں صبح ہونے تک
نہ پروانے نہ شمعیں اہل محفل ہیں نہ محفل ہے

بلند و پست عالم کو ابھی دیکھا کہاں تو نے
سنبھل کر پاؤں رکھ ناداں یہ ناہموار منزل ہے

نہ ہو کیوں شکلِ قیس ان سُرمگیں آنکھوں کا دیوانہ
یہ آنکھیں محملِ لیلےٰ ہیں سرمہ گردِ محمل ہے

کسے معلوم ہے کس گھاٹ عاشق پار اترے ہیں
الٰہی باڑھ پر دریائے آبِ تیغ قاتل ہے

لڑے گی کیا نگاہِ شوق چشم شوق قاتل سے
یہاں مرغِ نظر پہلی نظر میں نیم بسمل ہے

کہوں کیا ضعف کا عالم جہاں بیٹھا وہیں بیٹھا
تنِ بیمار کو ہر ہر قدم اک ایک منزل ہے

تمہارے ناز اٹھیں غیر سے خود دیکھ لینا تم
یہ کچھ میرا جگر، میرا کلیجہ ہے، مرا دل ہے

یہاں شاہ و گدا آعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہیں
عدم آباد کی منزل عجب ہموار منزل ہے

پلا دے کوئی ساغر جس سے حاصل بے نیازی ہو
مئے دیدار کا اے بے نیاز آزاد سائل ہے

⦿

اشکِ حسرت کے سوا زیرلب آہوں کے سوا   اور کیا جُرم؟ محبت کے گناہوں کے سوا
مونسِ روزِ جدائی کوئی ہوتا بھی تو کون   اشک پیہم کے سوا خون شدہ آہوں کے سوا
اس کی رحمت کی جو بندوں کو خبر ہو جاتی   کوئی کرتا نہ کوئی کام گناہوں کے سوا
نگہہ مہر کبھی لطف کبھی ناز کبھی   اور آنکھوں میں ہے کیا ان کی نگاہوں کے سوا
حسنِ اخلاق حسیناں پہ نہ جا اے آزاد
یہ کسی مد میں نہیں جھوٹے گواہوں کے سوا

⦿

غم دل تھا یہی محروم یہی غماز بھی تھا   کارِ پرداز بھی تھا خانہ برانداز بھی تھا
ننگِ شہرت ہے غلط شکوۂ غمازِ عبث   چھپکے پردے میں رہے عشق یہ وہ راز بھی تھا
چشم نرگس بسر و چشم مگر اے گلچیں   اس میں انداز نگاہِ غلط انداز بھی تھا
گفتگو ناصح مشفق کے نصائح میں نہیں   سننے والوں میں کوئی گوش برآواز بھی تھا
نغمہ سنجان چمن سے کوئی اتنا پوچھے   تم میں اک تلخ نوا زمزمہ پرواز بھی تھا
ہم بھی پھولوں کی نزاکت کے بہت قائل تھے   نازوالوں کا مگر ناز بھی انداز بھی تھا
جلوۂ برق تجلی میں نہ تھی کوتاہی   آنکھ والے تھے بہت کوئی نظر باز بھی تھا
نغمۂ مرغ خوشِ الحاں تو سنے ہیں کیا کیا   کوئی سنجیدہ خموشی کا ہم آواز بھی تھا
میٹھی باتوں میں حسینوں کی چھپی تھی تسخیر   یہی افسوں یہی جادو یہی اعزاز بھی تھا
مئے کدہ حضرتِ آزاد سے چھوٹا آخر
نا سزاوار بھی یہ سلسلہ ناساز بھی تھا

⦿

چشم و ابرو سے سوالِ غم پنہاں کرنا   سیکھ لے ان سے کوئی لطف نمایاں کرنا
اب وہ نظارۂ گستاخ کرشمہ جس کا   غمزۂ شوخ کو غارت گرِ ایماں کرنا
خندہ روئی سے گرانا دل و جاں پر بجلی   عقلِ دل باختہ کو سوختہ ساماں کرنا
گرم کرنا کبھی آشفتہ سری کا بازار   تمکنت کو کبھی شوخی کا نگہباں کرنا
دل پر اک داغ نیا غم کا اٹھانا ہر روز   خون کر دے جو کلیجہ وہی ارماں کرنا
بیٹھے بیٹھے تپشِ عشق کی سہنا چوٹیں   چپکے چپکے گلہ گردشِ دوراں کرنا
اتنی تعجیل نہ کر فصلِ بہار آنے دے
بُلبلِ طبع کو آزاد غزل خواں کرنا

⦿

خوش لباسی آنکھ کا کانٹا ہے اب   شوقِ دل مینائے بے صہبا ہے اب
لطف سے خالی ہے بزمِ ناؤ نوش   شام عشرت صبح نابینا ہے اب
سرد ہے ہنگامۂ بزمِ خیال   اپنی دنیا اک نئی دنیا ہے اب
خوں شدہ دل میں بھری ہیں حسرتیں   اب یہی مئے ہے یہی مینا ہے اب
دردِ دل کہنے کے لائق ہی نہیں   چارہ جوئی، سعی نازیبا ہے اب
نام باقی ہے فقط آزاد کا
طعنہ زن ہیں لوگ یہ طرۂ ہے اب

⦿

مرتبہ اپنی دہش کا یوں بڑھا دیتے ہیں ہم   کوسنے دیتا ہے ہم کو جو دعا دیتے ہیں ہم
خاطرِ سائل کی ہے ہم کو بچشم دل قبول   جام خالی پر سرِ مینا جھکا دیتے ہیں ہم

---

[1] دکن ریویو، شمارہ ۹، جلد ۲، ص ۵۲

مختصر یہ ہے کہ ان زلفوں کے تھے ہم بھی اسیر
طول دے کر اس فسانے کو بڑھا دیتے ہیں ہم

آپ اپنے ہاتھ سے رکھتے ہیں گردن پر چھری
خوں بہا کر آپ اپنا خوں بہا دیتے ہیں ہم

پوچھتے ہیں جب ہماری خانہ بربادی کا حال
رہ گذر کی خاک تھوڑی سی اڑا دیتے ہیں ہم

کوئی روئے یا ہنسے آزاد لیکن سن تو لے
مرثیہ اپنا عزیزوں کو سنا دیتے ہیں ہم

گستاخِ کرم معراجِ صفت گو بندۂ بے آداب ہیں ہم
کھوئے سے گئے پاتے ہی تجھے تو جب سے ملا نایاب ہیں ہم

اس دام گہہ خشک وتر میں دریا بھی نہیں ساحل بھی نہیں
پایاب کہو پایاب ہیں ہم غرقاب کہو غرقاب ہیں ہم

عالم کو خدائے عالم نے وابستۂ صد اسباب کیا
عالم ہے جو اپنا کیا کہئے اک عالم بے اسباب ہیں ہم

صرصر کی طرح ٹھہرے نہ کہیں ہم ہیں وہ مسافر ہستی کے
از صبح ازل تا شام ابد ہر ساعتِ پا بہ رکاب ہیں ہم

آنکھیں جو کھلیں تو کیا دیکھا مسجود جو تھا خود ساجد تھا
جو خواب نہ دیکھا یوسف نے اللہ وغنی وہ خواب ہیں ہم

ایک عالم میں ہیں دونوں سحر و شام یہاں
پا بہ زنجیر ہے خود گردشِ ایام یہاں

آگ ہے وادیٔ ایمن کی بھی کجلائی ہوئی
جلوۂ طور ہے خورشید لبِ بام یہاں

قصۂ آدم و حوّا کہیں افسانہ ہے
ہوسِ حورِ جناں ہے طمعِ خام یہاں

دانہ خرمن ہے تو ہے ہستی قطرہ قلزم
اور ہی رنگ میں ہے عالم اجسام یہاں

استحالات ہیں نیرنگِ تجلیٔ نظر
احتمالات ہیں مستلزمِ اوہام یہاں

جان ہے اس کے سوا صاحب ایمان ہے کون
جان وایماں کا حقیقت میں نگہباں ہے کون

رنگِ گل نالۂ بلبل میں جھلک ہے کس کی
وہ نہیں ہے تو چمن بند گلستاں ہے کون

کس مسیحا کی تجلی دل رنجور میں ہے
درد ہے کون اور اس درد کا درماں ہے کون

ہے طواف حرم و دیر پرستش کس کی
باعثِ تفرقۂ گبرو مسلماں ہے کون

اس کا اصرار قیامت غضب اس کا انکار
نفی واثبات سے بھی دست وگریباں ہے کون

کفر ہے کفر ہی آزاد ہے ایماں ایماں
کس سے اس درد کو کہئے کہ سخنداں ہے کون

مری تعمیر ہستی ہے فغاں میں
میں آوازِ جرس ہوں کارواں میں

کرے گا خاک میری کون برباد
نزاعیں ہیں زمین و آسمان میں

میری ہستی ہے میری بے قراری
تڑپ ہی جان ہے برقِ تپاں میں

گری آزاد بجلی آشیاں پر
چمک کیوں آج ہے درد نہاں میں

حقیقت آشنا ہوں طوطیائے چشم بینا ہوں
لہو رویا ہوں جس نیرنگ پر میں آج ہنستا ہوں

نوید کامیابی میری نظروں میں ہے ناکامی
ہنساتے ہو جن آنکھوں سے انہیں آنکھوں سے روتا ہوں

نہ کھٹکوں کس طرح چشم زمانہ میں کہ میں ہوں تو
جوابِ دامنِ گلچیں مگر آنکھوں کا کانٹا ہوں

کوئی جانے نہ جانے مجھ کو پہچانے نہ پہچانے
میں خود ہی اپنا مونس آپ ہی اپنا شناسا ہوں

عدد سے اور مجھ سے فرق جو کچھ ہے وہ اتنا ہے
وہ دانائی میں یکتا ہے میں نادانی میں یکتا ہوں

سخن ور ہی نہیں ہیں رونقِ بزم سخن کیا ہو!
نہ حالی ہیں نہ شبلی، میں ہی اک آزاد تنہا ہوں

راہ میں الفت کی از خود رفتگی منزل نہیں   ڈوب مرنا اک سہارا ہے یہاں ساحل نہیں
ہم سمجھ لیتے ہیں مشکل سخت مشکل ہے یہی   ورنہ جو مشکل نہ ہو آسان وہ مشکل نہیں
کیا مرے گھٹ گھٹ کے مرنا کیا مرے دل سے جیئے   ایسے مرنے ایسے جینے کا کوئی حاصل نہیں
سوزِ پروانہ ہے شرطِ عاشقی اے حق شناش   جذب مقناطیس و آہن عشق میں داخل نہیں
نا خدا ہے شوق زورق تختۂ پشت نہنگ   سالکانِ عشق خضر راہ کے قابل نہیں
صدر و پائیں رسم و آئیں کا جہاں ہے امتیاز   محفلِ آزاد گانِ عشق وہ محفل نہیں
زخم لاشِ بے کفن ہے محشر ستانِ خیال   شرح اِس اجمال کی تفصیل کے قابل نہیں
حال سے گزرے ہوؤں کا حال عبرت خیز ہے   حسرتِ ماضی نہیں ارمان مستقبل نہیں
بغض و کیں جور و جفا مکر و دغا زر و فریب   کون سا تیر اس نگاہِ ناز کے شامل نہیں
دل گزر گاہِ خیال یار رہے اے بے خودی   درد کے لائق نہیں ہے داغ کے قابل نہیں

لیلیٰ محمل نشیں کی دھوم تو صحرا میں ہے
قیس یہ کیا کم اگر ناقہ نہیں محمل نہیں

دھیان آیا ہے شب گور کا جب سے ہم کو   خاص اک انس ہے تاریکیٔ شب سے ہم کو
سختیِ دہر سے ہرگز نہیں شکوہ کوئی   ہے شکایت دل آرام طلب سے ہم کو
مئے سے پرہیز نہ قلت تھی مگر ساقی نے   نہ دیا جام کسی خاص سبب سے ہم کو
کس طرح دل میں کسی کے کوئی گھر کرتا ہے   یہ نہ آنا تھا نہ آیا کسی ڈھب سے ہم کو
ہم نہ سمجھیں تو نہیں منزلِ ہستی کا قصور   دیتی آئی ہے خبر کوچ کی کب سے ہم کو
قیس و فرہاد کو وامق کو تقدم ہے فقط   ورنہ دعوائے مساوات ہے سب سے ہم کو

قید ہستی سے رہائی جو ملی ہے آزاؔد
کیا فراغت ہے ہر اک رنج و لقب سے ہم کو

کسی کی پیاس بجھانا جو ہو تو آب تو دے   پیالہ زہر کا بھی ہو جو دستیاب تو دے
کسی کی جان بچانے میں کیا ثواب نہیں   ترے سبو میں جو کچھ ہو شراب و آب تو دے
سمجھ خدا کے لئے کب سے کہہ رہا ہوں میں   اگر نہ ہو مجھے دینا نہ دے جواب تو دے
خیال طبع سے غافل تو رہ نہیں سکتا   ملالِ طبع سے فرصت دل خراب تو دے
مجھے کسی کے تصور بغیر چین کہاں   ذرا جو چین دلِ خانماں خراب تو دے
ملے گا سنبل صحرا کو ہمسری کا جواب   وہ اپنی کاکلِ پیچاں کو پیچ و تاب تو دے
کلام صاف کے ہیں مدعی سبھی آزاؔد   اس آئینے کو کوئی یوں جلا و آب تو دے
خدا کے واسطے پھر تم کہو کہ تو کیا ہے   زباں سے پھول برستے ہیں گفتگو کیا ہے
بشر میں شانِ خدا ہے نزاکت اس گل کی   کھلا نہ کچھ کہ رگ گل ہے کیا گلو کیا ہے
بہارِ باغ جہاں بے ثبات ہے اے دل   بجز فریب نظر بزمِ رنگ و بو کیا ہے
جو اس کے کوچے میں کھویا گیا وہ دل ہو کہ میں   کوئی بتاؤ کہ اب اس کی جستجو کیا ہے
شہید ناز کی گردن جھکی نماز ہوئی   لہو سے غسل جہاں ہے وہاں وضو کیا ہے
نہ آب زر ہے نہ آبِ گہر نہ آب عنب   کسی غریب سے پوچھو کہ آبرو کیا ہے
پلا دے اوک سے ساقی سمجھ اشارۂ غیب   جہاں ہے بحر کرم جام کیا سبو کیا ہے
نہیں کسی کی نہیں اور ہے تو لا حاصل   اس آرزو کے لئے ترک آرزو کیا ہے
گرہ کشائے معانی نہیں تو کچھ بھی نہیں   اثر ہی جس میں نہیں کچھ وہ گفتگو کیا ہے

تمتّعات ہیں فیضِ ازل کے حصّہ خاص
نہیں تو شہرتِ آزاؔد چار سو کیا ہے

نمودِ برق بے جولاں کی ہستی کیا عدم کیا ہے   سمندِ مشربی بازیچۂ طفلاں سے کم کیا ہے
مشیت کا بھلا ہو کیسی آساں ہو گئی مشکل   خوشی جینے کی جس کو کچھ نہیں مرنے کا غم کیا ہے
نہ کھانا مغلطہ صاف اعترافِ ضعف باطن سے   جہاں ہے عزم راسخ حاجت قول و قسم کیا ہے
صدا ہے ناتوانوں کے شکستہ شیشہ دل کی   کوئی سوچے تو یہ آواز وطبل وعلم کیا ہے

یہ ہستی کیا ہے خود اک خواب آشفتہ کی انگڑائی
جھپک ہے دیدۂ بے خواب کی خوابِ عدم کیا ہے

فلک کی دشمنی ہے اپنی ہستی پر قومی حجت
جہاں ہوز ہر ہی امرت وہاں پر دائے سم کیا ہے

ہزاروں سر بکف ہو کر نہ پہنچے تیری غایت کو
رموزِ زندگی اللہ تیرا پیچ و خم کیا ہے

فریب سادہ لوحاں اک نمائش ہے سراب آسا
نمود و نام کیا ہے شہرۂ جاہ و حشم کیا ہے

ہم اس باطل پرستی کی فسوں کاری سے حیراں ہیں
اگر ہے نقش باطل دل نشیں نقش عدم کیا ہے

شرر سے کم نہیں ہر قطرۂ اشک اے حرم والو
شرر کو پھونک دینے کے لئے دیر و حرم کیا ہے

کہاں روتے پھریں طول حیات خضر کے غم میں
کہ مر مٹنے کو تھوڑی سی بھی قید عمر کم کیا ہے

فراغِ طبعی آخر مقصد سعی دو عالم ہے
اسی خرمن کا گوشہ ہے گلستانِ ارم کیا ہے

مصائب کی رفاقت میں بھی پہلو ہیں مصیبت کے
دو نیم اپنا جو دل ہے سینہ شق اپنا قلم کیا ہے

غضب ہے ایسے بیماروں کو ہے زعم مسیحائی
جو اس سے بے خبر ہیں فریبی کیا ہے ورم کیا ہے

کرم بھی ہے تو بے روئی ریا کم ہے درم دم ہے
تہی مغزی کے پہلو میں کفِ اہل کرم کیا ہے

دل افسردہ جو ارج سست آہ آزاد کی پیری
بس اک زندہ دلی اس کے سوا حضرت میں دم کیا ہے

⊙

امین راز ہستی ہے کہیں نابود ہوتا ہے
ہمیشہ در دِل میں کچھ نہ کچھ موجود ہوتا ہے

نظر آتا تو ہے دریائے عرفاں خوب ہی دلکش
سمجھ کا دائرہ لیکن بہت محدود ہوتا ہے

بچھا کر دیکھ لے آنکھیں تو اس کی راہ میں کوئی
وہ خود اپنی خوشی سے آپ آ موجود ہوتا ہے

پڑے پر تو جو خورشید تجلی کا تو روشن ہو
کہ ذرہ بھی کوئی اس دشت کا نابود ہوتا ہے

فنا کیا ہے بقا کیا ہے ہم اسکو کچھ نہیں سمجھے
مگر اتنا کہ جو موجود تھا موجود ہوتا ہے

خزاں کیا ہے بہار بوستانِ آفرینش ہے
فقط اک انقلاب دور ہست و بود ہوتا ہے

مقدر ہے حقیقت میں اگر نابود ہو جانا
عبث یارب ظہور ہستی نابود ہوتا ہے

حصولِ مدعا ہے مدعا سے ہاتھ اٹھا لینا
نقابِ چہرۂ مقصود خود مقصود ہوتا ہے

ہم اس توحید کی باز آئے تصدیق تصور سے
انا لا غیر جس میں حرف شرک آلود ہوتا ہے

خود اپنی بندگی کے لئے خدا کی بندگی کیسی
جو معشوقِ خیالی ہے وہی معبود ہوتا ہے

ہم اس معبود کے صدقے ہم اس موجود کے قرباں
کہ جب کوئی نہیں ہوتا تو وہ موجود ہوتا ہے

حریفِ نغمۂ آزاد ہوتا ہے وہ محزوں دل
جو درد آلود ہوتا ہے جو غم فرسود ہوتا ہے

⊙

یہی عشق بندہ نواز بھی یہی عشق شعبدہ باز بھی
یہی برق جلوۂ ناز بھی یہی سوز بھی یہی ساز بھی

کوئی مرغ زمزمہ ساز ہے کوئی شمع سوز و گداز ہے
وہ جو مست شوق و نیاز ہے وہی ہے خزینۂ راز بھی

نہ قیام ہے نہ قعود ہے نہ رکوع ہے نہ سجود ہے
کہ نمازِ ترکِ وجود ہے یہ نماز بھی ہے نماز بھی

جو ہوائے بزمِ حضور ہے سر لطف کیف و سرور ہے
تو سپندِ آتشِ طور ہے یہ شراب عشق مجاز بھی

کوئی نغمہ ہو کوئی زمزمہ ہو جو کچھ بھی درد بھری صدا
وہی پردہ مجھ کو عراق کا وہی صوت لحن حجاز بھی

عجب ایک شان ظہور ہے کوئی خاک ہے کوئی نور ہے
جو خمار ہے تو سرور ہے جو نشیب ہے تو فراز بھی

وہ عیاں ہوں راز جو ہیں نہاں یہ بیاں ہو واعظ مہرباں
کہ جہاں ہے حرمت مئے وہاں نکل آئے شکل جواز بھی

جو نصیب عرض حیات ہے تو نشاط طول ثبات ہے
یہ نہیں تو مرگ و ممات ہے خضر ایسی عمر دراز بھی

نہیں حسن و عشق میں کشمکش وہ جو اس سے خوش تو یہ اس سے خوش
دل غزنوی ہے جو نالہ کش تو ہے چنگ زلف ایاز بھی

نہ تخلص آئے تو کیا کروں کوئی طرح ایسی بنا کروں
وہ جو مدعا ہے ادا کروں کہ عبث نہ ہو تگ و تاز بھی

مرا نام گو کہ ہے فضل حق میں برنگ خامہ ہوں سینہ شق
نہ محلِ زمزمۂ ادق نہ مجال عرضِ نیاز بھی

⊙

جب چلی مہرباں رُکتی ہے
کہیں چلتی زباں رکتی ہے

پہنچے گی کان تک فرشتوں کے
چلی جاتی ہے تان رکتی ہے

تم رُکے کیا کہ لب تک آنے میں
سانس بھی میری جان رکتی ہے

اُگلی ہی پڑتی ہے میاں سے تیغ   کہیں یہ بد زبان رکتی ہے
کس طرح کہیئے حال دل آزؔاد
کہتے کہتے زبان رکتی ہے

⊙

محبت کے کرشمے میں بھلائی ہے بُرائی بھی
ادا ہے کج ادائی بھی وفا ہے بے وفائی بھی

خدا کی شان دیکھی اور کیا اس کے سوا دیکھا
وہی شانِ خدا ہے ان بتوں کی خودنمائی بھی

بتوں ہی سے خدا کی راہ پائی اس کے بندوں نے
خداشاہد خلیل اللہ بھی ساری خدائی بھی

وہ دل کیوں کر خدا کا گھر ہو اے زاہد کوئی کہہ دے
جہاں یادِ خدا ہو اور کافر ماجرائی بھی

اُسی اک پردہ دل میں ہے کیا کیا کچھ کوئی دیکھے
خدابھی خود پرستی بھی خودی بھی خودنمائی بھی

خداوالوں کے ہوتے کیوں نہ ہوں دونوں جہاں روشن
انہیں کے ہاتھ میں ہے بندگی بھی کبریائی بھی

مہمات دو عالم سے کھلا یہ عقدۂ مشکل
جہاں ہے کوئی مشکل ہے وہیں مشکل کشائی بھی

فروغِ عقل نے انسان کی آنکھیں بھی کھولی تھیں
اُسی نے پھیر دی پھر سب کی آنکھوں میں سلائی بھی

طلسم حیرت افزا ہیں سوانح زندگانی کے
یہی دنیا میں لائی لے گئی بھی ، پھیر لائی بھی

بری الزام سے نکلی جو دل سے آرزو نکلی
لگائی بھی اسی نے پھر لگی دل کی بجھائی بھی

عدو کے ساتھ میں بھی ان کے غصے میں نہ پڑ جاؤں
مرے ہی سر نہ آ جائے کہیں دشمن کی آئی بھی

نصیحت چپ کے پی لینے کی اے ناصح غنیمت ہے
اگر ہے اس میں گمراہی تو ہے کچھ رہنمائی بھی

زمیں زیرِ نگیں ہے زیرِ فرماں ہے فلک یارب
خراجِ ہفت کشور ہے ترے در کی گدائی بھی

مقدر کھینچ لایا آتے آتے ہم بھی آ پہنچے
نصیبوں میں نہ تھی لیکن مقدر آزمائی بھی

وہ طوفاں اور وہ موجیں یہ ساحل یہ سبک ساری
خدا کی ہے خدائی اے خضر یہ ناخدائی بھی

نہیں چلتی اگر بے آب زر اخلاص کی کشتی
تو بے روغن نہیں جلتا چراغ آشنا کی بھی

ابھی سے دے رہی ہے وصل کی شب دھمکیاں ہم کو
ہمارے ساتھ ہے ناداں غم روزِ جدائی بھی

سرودِ ساز وحدت سے چراغاں ہے جہاں سارا
اسی کی گونج سے سرشار ہیں نئے اور نائی بھی

نہیں اک نغمہ داؤد سے شمع حرم روشن
نوا پرواز ہے اک خوش نوا کی ہمنوائی بھی

نہیں آزؔاد ہی اک خوشہ چین خرمنِ حکمت
اسی کے دانہ کش ہیں سب ثناعی و سناعی بھی

⊙

جاں بلب ہوں اور پیغام وصال آیا ہوا
ڈھل چکا خورشید ہے وقت زوال آیا ہوا

کیا ہوا چہرے پہ ہے کیوں اک ملال آیا ہوا
ساقیا ہے کس طرف تیرا خیال آیا ہوا

کہہ نہیں سکتے مگر شرطِ مروت ہو تو خیر
لب پہ میرے دیر سے ہے اک سوال آیا ہوا

کیا ستم ڈھاتی ہوئی مستانہ چلتی ہے نسیم
کیا امنگوں پر ہے گلشن میں نہال آیا ہوا

لہلہا اٹھنا وہ سبزوں کا وہ پھولوں کی قطار
کیا گلستاں پر ہے حسن ذوالجلال آیا ہوا

پھٹ پڑا ہے روئے سوسن پر بھی کیا ظالم شباب
حسن پر ہے اپنے ہر صاحب جمال آیا ہوا

ساغر مینا بکف آئی ہوئی ہے شاخ گل
جام مینا در بغل ہے ہر نہال آیا ہوا

لے کر بیٹھا ساقی مہوش جو اک جام بلور
میں نے یہ سمجھا زمیں پر ہے ہلال آیا ہوا

یوں تو دنیا میں حسیں لاکھوں ہیں بڑھ کر اک سے اک
پر اُسی کا حسن ہے اک بے زوال آیا ہوا

ترانۂ دہقاں

اپنا غریب خانہ آرامِ بے ارادہ
دروازہ جس مکاں کا پیشانی کشادہ

صحرا فزائے خانہ مہماں چراغِ خانہ
اسبابِ زندگانی یکدست سادہ سادہ

جو چاہئے بقدرِ حاجت سبھی فراہم
سامانِ زندگانی کچھ کم نہ کچھ زیادہ

گنجینہ درشکم دہ ہر کِشتِ سبز و خورّم
اور آنے والی فصلی انبارِ پس نہادہ

پیغامِ کامرانی وہ بادِ برشگالی
خرگاہِ شادمانی بارانِ ایستادہ

چوپایوں کے لئے بھی کوئی کمی نہیں ہے
خرمن گہہِ علف ہے ہر کِشتِ اوفتادہ

پروردہ ایک سگ بھی دربانِ روز و شب ہے
پاسِ وفا کا جس کی گردن میں ہے قلادہ

کیا دخل اس کے ہوتے اس گھر کے پاس پھٹکے
درِندہ کوئی کیسا ہو کیوں نہ خود مرادہ

آزادیاں تھیں شامل کیا عافیت تھی حاصل
وہ سب سہولتیں ہیں یکسر بہ باد دادہ

اس اوجِ ارتقاء پر گو آگئی ہے دنیا
اوضاعِ زندگانی بس مشکل اوفتادہ

کمالِ نقص

میں تو بے شبہ ہوں سراپا نقص
دیکھیں اہلِ کمال اپنا نقص

ماہِ کامل میں ہے کلَف کا عیب
مہرِ روشن میں ہے گہن کا نقص

ذرّہ ذرّہ ہے صاف صاف عیاں
ایک پر ایک کا ہے بالا نقص

چار دِن کی ہے چاندنی کی بہار
صاف روشن ہے جیسے تارا نقص

ہات کا میل زر کو کہتے ہیں
بے زری کا ہے آشکارا نقص

روزِ روشن کے واسطے شب تار
روشنی کے لئے اندھیرا نقص

داغِ افلاس مفلسوں کے لئے
اہلِ دولت کو زر کا توڑا نقص

ہے عجب دھوپ چھاؤں کا عالَم
ہنر اِس کا جو ہے وہ اُس کا نقص

نازُکی عیب پہلوانوں کا
پہلوانی پر ریخوں کا نقص

حسنِ بے ناز بے نمک یکسر
نازِ بے حُسن انتہا کا نقص

خامشی بے سبب سراپا عیب
سخنِ بے محل سراپا نقص

زندگی سے جہاں میں سب کچھ ہے
اِس کو بھی ہے اجل کا کھٹکا نقص

نشے کو بھی خمار لازم ہے
عیش کا ہے یہ حیرت افزا نقص

ہے ہُنر کو کسادئ بازار
کِس غضب کا یہ ہے خدایا نقص

علم سے قدرِ اہلِ عِلم و ہُنر
اِس کو بھی مال کا نہ ہونا نقص

سود کو ہیں زیاں کے سوگھڑاگ
نفع کے واسطے ہے گھاٹا نقص

فتح کو ہے شکست کا دھڑکا
رنج کا ہے خوشی میں آنا نقص

دولتیں سب کی سب زوال پذیر
ہائے پیشِ نظر ہیں کیا کیا نقص

اِس جہاں میں ثبات ہے کِس کو
بے ثباتی بھلا ہے کم کیا نقص

گُلِ بے خار اِس چمن میں نہیں
پھول کے واسطے ہے کانٹا نقص

کہیں اِس کے خلاف ہوتو ہے شاذ
شاذ ہونا ہی کیا ہے تھوڑا نقص

کوئی نقصان سے نہیں خالی
کہیں اتنا کہیں ہے اتنا نقص

ثانیاً نقص ہے دلیلِ کمال
کہ اگر مجمیں کچھ نہ ہوتا نقص

قدرِ اہلِ کمال کیا ہوتی
بے حقیقت نہیں یہ میرا نقص

ایک فرقِ مجاز ہے ورنہ
کیسا نقصان اور کہاں کا نقص

ناقص آزادؔ پر نظر کیں ہے
آپ کا یہ کمال ہے یا نقص

شبنم

چہرہ پردازِ چمن آئینہ ساماں کہیئے
عرقِ روئے زمیں دیدۂ حیراں کہیئے

سیلِ کا فورِ سَحر کیجئے اوّل اسے فرض
چاہئے پھر تو طبا شیرِ گلستاں کہیئے

شاہدِ گل کے لئے گوہرِ آویزۂ گوش
صبحِ خنداں کے دہن کا دُرِ دنداں کہیئے

اُس کے رُونے سے دُرافشاں ہے ہنسی پھولوں کی
اشکِ شادی صدفِ خندۂ پنہاں کہیئے

تشنہ کا مانِ چمن سب ہیں اِسی سے سیراب
رشحۂ ابرِ کرم بارشِ احساں کہیئے

مَست کرتا ہے شعاعوں کو چمکنا اِس کا
شیشۂ بادۂ خورشیدِ درخشاں کہیئے

برہمن کی اسے بکھری ہوئی کہیئے سُمرن
منتشر دانۂ تسبیحِ مسلماں کہیئے

اور اگر اِس کو سمجھتے ہیں سخن پردازی
کچھ نہ کہیئے تو بھلا شبنمِ غلطاں کہیئے

منظرِ صبح

زہے وہ خندۂ پنہاں بہارِ منظرِ صبح
زہے وہ حُسنِ سراپائے نورِ پیکرِ صبح

زہے وہ سرمۂ ظلمت۔ زہے وہ جلوۂ نور
زہے وہ طالع روشن۔ زہے وہ اخترِ صبح

سوادِ طرۂ شب ہے۔ کہ شامِ گیسوئے یار
شپیدۂ سحری ہے کہ روئے دلبرِ صبح

ندائے حَیّ مؤذّن صلائے عاملِ صبوح
صدائے کوس و دِرا۔ وضعِ فیض گسترِ صبح

رواں ہے ناقۂ لیلائے شب گُسستہ مہار
کہ دستِ دیوِ فلک میں ہے تیز خنجرِ صبح

بجائے نہر لہن ہے سُپیدۂ سَحَری
نہیں یہ نور کا تڑکا رواں ہے کوثرِ صبح

رہے گا چار پہر گرمِ بال افشانی
ابھی ہے رقص میں طاؤسِ آتشیں پَرِ صبح

ہوا ہے پیر فلک دستِ رعشہ دار میں ہے
جھلک رہا ہے۔ شرابِ شفق سے ساغرِ صبح

بجز مشامِ سَحَر خیز اور کِس کو نصیب
مَشامۂ طرب انگیز و روح پرورِ صبح

غلافِ نور ہے ڈھانکے ہوئے ہر اِک شئے کو
جبال و دشت سراسر ہیں زیرِ چادرِ صبح

نہیں یہ نورِ سَحَر ہے غبارِ نقرۂ خام
شعاعِ مہر نہیں ہے قراضۂ زرِ صبح

بھرے ہیں ساغرِ لعلیں۔نہیں گلاب کے پھول
نہیں یہ شبنمِ تر منتشر ہیں گوہرِ صبح

صباحتِ رُخِ خنداں لطافتِ گلِ تر
یہی خزینۂ زر ہے یہی ہے زیورِ صبح

جو پھول ہے وہ زرِ گل سے بوتۂ زر ہے
چمن نہیں ہے یہ ہے دست گاہِ زرگرِ صبح

ہوئے ہیں بابِ کرم باز ہر طرف ہے ہجوم
کھلا اُمید کا دَر بھی جو کھُل گیا درِ صبح

پیاسِ خاطر آرامشِ نباتِ نبات
بچھائی دھوپ نے صحرا میں مسندِ زرِ صبح

نوائے صحنِ گلستاں غریوِ دامنِ دشت
بپا ہے چار طرف زیرِ چرخ محشرِ صبح

مُخدّراتِ فلک کے بھی کان پر ہیں ہات
یہ نالۂ سحر آزادؔ ہے کہ نشترِ صبح

یادِ معبود

للہ الحمد فرح بخش ہے عنوانِ بہار
زینۂ یادِ خدا ہے سرو سامانِ بہار

اللہ اللہ گل و سنبل و ریحانِ بہار
محوِ تسبیح ہے ہر مرغِ خوش الحانِ بہار

اَنْتَ لَا غَیْر کی کانوں میں صدا آتی ہے
بوئے گل پڑھتی ہوئی صلِّ علیٰ آتی ہے

کیا بہار آئی ہے کیا فصلِ بہاراں کو ہے جوش
گل کی افراط سے ہے بلبلِ نالاں خاموش

سر بہ سر دیکھ کے اشجارِ چمن کو رُوپوش
اَنْتَ سُبْحَانَکَ ہے وِردِ زباں ہر ہوش

ایک پر ایک ہے سرگرمِ ثنا بڑھ چڑھ کر
طائر اُڑتے ہیں رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ پڑھ کر

آتشِ گل کا ہَوا پا کے لہکنا ہے غضب
تازہ کلیوں کا سرِ شاخ چٹکنا ہے غضب

پھولوں کے بوجھ سے شاخوں کا لچکنا ہے غضب
طائروں کا سرِ ہر شاخ چہکنا ہے غضب

یادِ معبود میں کیا اِن کو مزا آتا ہے
یاد بھولے سے کبھی ہم کو خدا آتا ہے

شبِ تاریک اور شاعر

(شبِ تاریک)

اُف یہ سنّاٹا یہ تاریکی یہ جنگل دہنے بائیں تیز تر جھونکے ہوا کے چلنے والے سائیں سائیں
دو قدم انساں اِس ظلمت میں چل سکتا نہیں گھر سے باہر نورِ بینائی نکل سکتا نہیں
آب آب اس وقت کی دہشت سے ہیں قلب وجگر ٹوٹی پڑتی ہیں بلائیں ہو نکتے ہیں شیرِ نر
سب پر اِک سکتے کا عالم ہے کھڑے کیا ہیں درخت پتّے پتّے پر کوئی دیکھے تو ہے یہ وقت سخت
صورتِ حالِ گلستاں ہر طرح مجہول ہے چادرِ شبنم میں ہے سمٹا ہوا جو پھول ہے
موجِ دریا خارِ ماہی کی صفت پوشیدہ ہے سینۂ صحرا میں جادہ اِک رگِ خوابیدہ ہے
مجکو اِک زرّیں کُلہ سے ہے زمانہ میں ستیز ماہِ تاباں تو مرے سائے سے کرتا ہے گریز
چھوڑ دے دامن مرا ظلمت میں کیوں کرتا ہے گھر
جان لے دنیا کو۔ ہے اِک خواب اے آشفتہ سر

شاعر

تیری تاریکی میں ہے شمعِ تجلّی کی جھلک تیری ظلمت دیدۂ بے خواب کی ہے مَردُمَک
تجسے ہے خونا بہ در دِل نافۂ مشکیں غزال تیری تاریکی نہیں ہے شمعِ فانوسِ خیال
دن کے ہنگامے سے ہے دلکش فزوں تیرا سکوت ہے یہ شاعر کے لئے جاں بخش روح افزا سکوت
تیرے پردے میں نظر آتی ہے وہ دنیا مجھے خواب بھی جس کا نہ اِس دنیا نے دکھلایا مجھے
چُپکے چُپکے تیری خاموشی کے بجتے ہیں جو ساز روح سے پوچھے کوئی ہوتے ہیں کیسے دلنواز
یہ تو کس منھ سے کہوں صدق وصفا آئیں ہوں میں تیرے باغِ بے خزاں کا ہاں مگر گلچیں ہوں میں
عندلیبِ زار ہوں کس طرح گلشن چھوڑ دوں چھوڑ دے دنیا تو میں بھی تیرا دامن چھوڑ دوں
دل تو روشن ہے بلا سے ہے جو گھر تاریک ہے
لے سلام اے لیلیٰ ظلمت سحر نزدیک ہے

عقل وعشق

وہ گئے دن جبکہ ناچاقی تھی عشق وعقل میں تھا زمین وآسماں کا فرق اصل ونقل میں
عقل ناقص تھی، خطا اندیش، سنگِ راہ تھی کور باطن، عشق دشمن، آفتِ جانکاہ تھی
شعلہ خو تھا عشق، بے پروا تھا، شورانگیز تھا دشمنِ جاں، خانہ ویرانی کو اِک چنگیز تھا
اب عقل اندھی، نہ عشق شعلہ خو بیباک ہے
مصلحت اندیش ہیں، دونوں، یہ قصّہ پاک ہے

جاڑوں کی دھوپ[1]

جب جھلک مشرق سے دِکھلاتی ہے دھوپ اُونچے کوٹھے پہلے چمکاتی ہے دھوپ
صحن میں پھر پاؤں پھیلاتی ہے دھوپ آتے آتے تا زمیں آتی ہے دھوپ
کس قدر جاڑوں میں اِتراتی ہے دھوپ
ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتی چلی انجروں کی گیند لڑھکاتی چلی
آئینہ ذرّوں کا چمکاتی چلی گرم کرتی اور گرماتی چلی
گرمیاں کرتی چلی آتی ہے دھوپ
قطرے بن جائیں گے اب دُرِّ نجف آئینہ اب ہے خزف ہے یا صدف
بڑھتی آتی ہیں شعاعیں صف بہ صف بھاگتا جاتا ہے سایہ اِک طرف
اِک طرف سایے کو لوٹاتی ہے دھوپ
جب یہ پھیلاتی ہے اپنے ہاتھ پاؤں سِکّہ پڑ جاتا ہے اس کا گاؤں گاؤں
کیا طلسمی پنجے کیا ٹھگی ہیں داؤں دشت بن جاتا ہے یکسر دھوپ چھاؤں
اطلسِ زرّیں بچھا جاتی ہے دھوپ

خشک و تر دونوں پہ اس کی ہے نظر   اس کی آنکھوں میں ہیں یکساں بحر و بر
پاک تر ہو یا کوئی آلودہ تر   پاک دامانی کو اس کی کیا ضرر؟
ہر نجس کو پاک کر جاتی ہے دھوپ

اِس کو ملنے میں کسی سے کب ہے عار   کیا ملنساری ہے اِس میں کیا وقار
کوہ ہو یا کاہ ہو گل ہو کہ خار   سب سے جھک کر ملتی ہے یہ خاکسار
خاکساری ہم کو سِکھلاتی ہے دھوپ

لعل کا معدن ہے گلشن کی زمیں   سبز پتّے ہیں زمرّد کے نگیں
ہر شجر اپنی جگہ ہیں شہ نشیں   شبنم آنسو پونچھ لیتی ہے وہیں
آئینہ جب اس کو دکھلاتی ہے دھوپ

صبح کا ہنسنا ہے اس کا نو شخند   گریۂ شبنم ہے اس کو ناپسند
پھول ہنستے ، چہچہاتے ہیں پرند   نغمۂ رنگیں ہیں اِس سے سر بلند
میٹھے میٹھے بول سنواتی ہے دھوپ

ساز ہستی اس کے ہے زیرِ علَم   سب اُسی کا ہے عرب ہے یا عجم
مشرقی کمرے سے اُٹھ کر صبح دم   شعلے کی صورت لپکتی ہر قدم
لمبے لمبے پاؤں پھیلاتی ہے دھوپ

خاک کے طبقے سُنہرے ہوگئے   پھول اور پتّے سنہرے ہوگئے
آنکھ کے پردے سنہرے ہوگئے   جو ، رؤ پہلے تھے سُنہرے ہوگئے
اِک ورق سونا چڑھا جاتی ہے دھوپ

کوہ پر چمکی کبھی گلزار پر   خاکِ رَہ پر گنبدِ دستار پر
جھوپڑے پر قیصری دَربار پر   اس کا سایہ ہے گلوں پر خار پر
رفتہ رفتہ چھاؤنی چھاتی ہے دھوپ

گُل کے انگاروں کو کردیتی ہے لال   پھول پتے سب کو کرتی ہے نہال

ننگی خلقت کو اُڑھا دیتی ہے شال   سیف ہے سُرما تو یہ گینڈے کی ڈھال
ٹھنڈ کی تلوار کب کھاتی ہے دھوپ

بڑھتی جاتی ہیں اب اِس کی گرمیاں   ہیں تنزل پر اب اِس کی نرمیاں
ہے مٹھاس اِس نرمیوں کے درمیاں   تلخیوں میں اس کی ہیں بے شرمیاں
کرتی ہے عریاں جو کڑواتی ہے دھوپ

گرمیوں میں اِس کے ہیں کچھ اور طور   ظاہراً کرتی ہے گو یہ ظلم و جور
ایک چال اِس کی نہیں بے فکر و غور   خاص اِک رحمت ہے اِس کا پاک دور
بجلیاں ساون میں چمکاتی ہے دھوپ

چھاتیاں دریا کی گرماتی یہ ہے   اِک سمندر دَم میں پہنچاتی یہ ہے
کالی کالی بدلیاں لاتی یہ ہے   بدلیاں لا لا کے برساتی یہ ہے
ابر کا دامن نچڑواتی ہے دھوپ

کھیتیوں کو لہلہاتی ہے یہی   سبزے صحرا میں جماتی ہے یہی
بوستاں میں گُل کھلاتی ہے یہی   فیض کا دریا بہاتی ہے یہی
ابر سے دریا کو شرماتی ہے دھوپ

ہے بہار اِس سے خزاں بھی اس سے ہے   کال اِس سے ہے سماں بھی اس سے ہے
صرصروبرقِ دماں بھی اِس سے ہے   آندھیاں اِس سے اماں بھی اس سے ہے
پیڑ لگواتی اُکھڑواتی ہے دھوپ

برف کی جانب جہاں کرتی ہے مَیل   بہہ چلی دریا کی صورت پھیل پھیل
خادموں میں ہے سُہایا ہے سُہَیل   چاندی سونا ہاتھ کا اس کے ہے مَیل
سیم و زر خاطر میں کب لاتی ہے دھوپ

دو پہر بجتی ہے سَر پر دھوپ ہے   ذرّہ پرور مہر گستر دھوپ ہے
قیمتی سو نے کا پتّر دھوپ ہے   بلکہ سونے سے بھی بہتر دھوپ ہے

خاک میں زر کو ملا جاتی ہے دھوپ

دو پہر ڈھلتے ہی سایہ ڈھل گیا — استوا سے مہرِ خاور ٹل گیا
فطرتی گردش کا فقرہ چل گیا — وقتِ آخر آگیا۔ اوّل گیا
گندھکی ہوتی چلی جاتی ہے دھوپ

زعفرانی ہے بسنتی ہے کبھی — باولے کا تار تنتی ہے کبھی
روٹھتی ہے اور منتی ہے کبھی — رَوزنوں میں آکے چھنتی ہے کبھی
چھن ہوئی جاتی ہے گہناتی ہے دھوپ

اپنی چلتی چھاؤں دِکھلاتی ہے جب — لمبے لمبے پاؤں سرکاتی ہے جب
سبز گھوڑے اپنے دوڑاتی ہے جب — ایک نقطے پر سمٹ جاتی ہے جب
کِس غضب کی آنکھ دِکھلاتی ہے دھوپ

دھوپ اب رخصت ہے پھولی ہے شفق — عارضِ خورشید کا ہے رنگ فق
اہلِ عالم کو نہ ہو کیونکر قلق — شام کی فوج آگئی اُلٹا ورق
جھگڑے دِن بھر کے چکا جاتی ہے دھوپ

وہ چراگاہوں سے چوپائے چلے — طائروں میں چہچہے ہیں ولولے
آگئے اپنے ٹھکانے دِل جلے — سب سرائیں بھر گئیں اوپر تلے
اس کے گھر اس کو پہنچواتی ہے دھوپ

محوِ عیش آمر بھی ہے مامور بھی — پاؤں پھیلائے ہے اب مزدور بھی
رام ہے مغموم بھی مسرور بھی — اب قریب آرام ہے اور دور بھی
صحبتیں یاروں سے گرماتی ہے دھوپ

گرم اب ہونے کو ہے بزمِ سرور — ہر چراغِ خانہ ہے اِک شمعِ طور
نور کی قلت ہے ظلمت کا وفور — کاسۂ مہتاب میں چھنتا ہے نور
چھپ کے بھی چھب اپنا دِکھلاتی ہے دھوپ

شمع روشن ہے تو راسی دھوپ ہے — چھاؤں تاروں کی ذرا سی دھوپ ہے
یہ چمک ہیروں کی باسی دھوپ ہے — چاندنی اِک دلربا سی دھوپ ہے
دو گھڑی میں اب نکھر جاتی ہے دھوپ

گرمیاں بھی سردیاں بھی اِس میں ہیں — مردیاں نامردیاں بھی اِس میں ہیں
درد بھی بے دردیاں بھی اس میں ہیں — صاف ہوکر زردیاں بھی اس میں ہیں
روز و شب رنگ اپنا جھمکاتی ہے دھوپ

اس کے ہر ہر رنگ میں نیرنگ ہے — اِس کی بے رنگی بھی رنگا رنگ ہے
کیا نرالا رنگ اچھوتا ڈھنگ ہے — اِس سے ہے رنگین، گُل یا سنگ ہے
رنگ میں نیرنگ دِکھلاتی ہے دھوپ

یہ چلی جائے تو جانے پر نہ جاؤ — اِس کا دنیا سے نہیں جاتا لگاؤ
اِس کے ہیں اِک سادہ پن میں سو بناؤ — آؤ بس آنکھیں نہ اب اس سے لڑاؤ
شپّرہ کو کور کر جاتی ہے دھوپ

بے ثباتیِ دنیا

باغِ جہاں کہ منظرِ آدم فریب ہے — نیرنگیوں سے ہے جو اسے حسن و زیب ہے
سیر اِس چمن کی سیرِ فراز ونشیب ہے — سرتا سر اِس سے داغ دلِ ناشکیب ہے
کیا کیا یہاں اُکھڑ گئے۔ بادل بسے ہوئے
آبادیاں اُجاڑ ہیں۔ خُتک جنگل بسے ہوئے

وہ خوبرو کہ چشمِ فلک جن سے تھی خُنک — وہ نازنین کہ پھول سے بھی تھے کہیں سُبُک
ایک اُن کا بانکپن ، نہ رئیسوں کے سوَ تزُک — ہنستے تھے جب تو برق ملاتی تھی تک سے تک
عُقدے دلوں کے جن کے تبسّم سے کھُلتے تھے
کانٹوں میں کھنچ گئے وہ جو پھولوں میں تُلتے تھے

پھولوں کو سازگار یہاں کی ہوا نہیں   غنچہ کھلا وہ کون کہ مُرجھا گیا نہیں
گلہائے باغِ دہر میں بوئے وفا نہیں   رنگِ بہار کیا کہ خزاں کو بقا نہیں
پھل رہ گیا کوئی نہ کوئی دانہ رہ گیا
پامال ہوکے سبزۂ بیگانہ رہ گیا

وہ در کا ہے یہ باغ بہار اس کی ہے دو رنگ   موت و حیات، حسرت و امید صلح و جنگ
جلتے ہیں داغِ دل کہیں بجتے ہیں جل ترنگ   ہے نت نئی روش تو نرالے ہیں رنگ ڈھنگ
چلتا نہیں ہے زور کوئی ہات پاؤں کا
عالم ہے اک عجیب یہاں دھوپ چھاؤں کا

گلشن میں گل نہیں، رُخِ تاباں کسی کے ہیں   سنبل نہیں یہ بال پریشاں کسی کے ہیں
نرگس کے پھول دیدۂ حیراں کسی کے ہیں   بیلیں نہیں، اُمنگ پر ارماں کسی کے ہیں
آئینہ ذرّہ ذرّہ ہے، ماضی و حال کا
عالم ہے اِک طلسمِ سراپا خیال کا

شمس و قمر کی زیور ہستی ہے اِن کی ضَو   ڈر ہے ڈُبو نہ لے کہیں ان کو فنا کی رَو
گندم کوئی بچاہے، بچے گا یہاں نہ جَو   کِشتِ حیات ہونے کو ہے ایک دِن دِرَو
غرّہ یہاں فضول ہے بے جا غرور ہے
جو آ گیا یہاں، اُسے جانا ضرور ہے

دِل اِس سے ہیں تباہ، خراب اس سے کارِ دیں   دامن کشوں نے تین طلاقیں، اسی کو دیں
اس بیسوا نے رنگ جمایا کہاں نہیں   مردانِ حق پہ تیز رہی اس کی تیغ کیں
آنکھیں چُرا گئی یہ نبی سے امام سے
آقا اِسی نے قتل کرائے غلام سے

اے دِل جہاں اور اسکے ہیں سب کاروبار ہیچ   گلشن یہ بے ثبات ہے، اِس کی بہار ہیچ
فِکرِ حصولِ دَولتِ ناپائدار ہیچ   ہستی کے طنطنے ہیں سب انجام کار ہیچ
روئے نیاز و چشمِ تماشا، عبث عبث
سر سبزیٔ نہالِ تمنا، عبث عبث

صریرِ قلم

ہر صفحہ ہو جوابِ گُل و گلستاں قلم   ہنگامِ گلفشانیٔ مضمون ہے ہاں قلم
الحق ہے ترجمانِ زبان و بیان قلم   یارب کڑی سنائے تو ہو وہ زباں قلم
ہر لفظ سے تجلیٔ معنی ہو آشکار   کھل جائے آج جوہرِ حُسنِ بیان قلم
مانندِ ابر جھوم کے اٹھّا ہے وجد میں   رکتا ہے اب کسی سے ہمارا کہاں قلم
وہ گُل کھلے کہ دیکھ کے کلیاں چٹک گئیں   بادِ سحر چلی کہ ہوا ہے رواں قلم
روشن ہیں دائرے کہ منوّر ہیں ماہتاب   صفحہ جو آسمان ہے تو ہے کہکشاں قلم
آنکھیں ہیں باغ باغ نگاہیں نہال ہیں   گلشن میں گُل کھلے کہ ہوا گلفشاں قلم
مرکز کی یہ کشش سرِ صفحہ نہیں کہ ہے   بدبیں کے حق میں تانے ہوئے برچھیاں قلم
ممدودہ ہر الف سے پئے ردِّ ہر بلا   دیتا ہے دونوں ہاتھ اٹھا کر اذاں قلم
خُرمائے ترشے بڑھ کے رسیلی ہے بیت بیت   ہے آج ریشے ریشے سے شکّر فشاں قلم
یکسر سرِ جراحتِ خامہ قلم ہے آج   دکھلا رہا ہے جوہرِ تیغِ زباں قلم
کیونکر زبان نہ کاٹ کے پھینکیں زباں دراز   چلتی ہوئی ہے تیغ دمِ امتحاں قلم
میں دل فگار ہوں تو قلم سینہ چاک ہے   میں بد زباں ہوں نہ مرا بد زباں قلم
نزدیک و دور اپنے تصرف سے کب ہے دور   گھر بیٹھے ناپتا ہے زمیں آسماں قلم
پیری میں فکرِ شعر کے آزاد ہیں مزے
میں پیر ہوگیا تو ہوا اب جواں قلم

وقت

وقت کہتا ہے کہ اک گوہر نایاب ہوں میں
میری دقعت کو جو پہنچو میری قیمت کو جو پاؤ

ایک میں دونوں جہاں میرے تصرف میں ہیں
میری تاثیر کی کوئی نہ سپَر ہے نہ بچاؤ

یہ حسابِ قمری اور نظامِ شمسی
اک مرے جام کی موج ایک سبو کا چھلکاؤ

دورِ ایّام ہے اک میرے نفس کی جنبش
جنبشِ ہر نفسِ دہر پر اپنا ہے دباؤ

مرگ بازیست ہے دونوں کو تعلق مجھ سے
فصلِ گُل فصلِ خزاں دونوں کو مجھ سے ہے لگاؤ

جاکے آؤں نہ کبھی اور جب آؤں نہ ٹلوں
میں انوکھا میرے دنیا سے انوکھے برتاؤ

دھیمی چالوں میں مری ہے وہ بلا کی سُرعت
سرعتِ برقِ جہندہ بھی جہاں ہے ٹھہراؤ

برق تھمتی ہے یہاں اور ہوا رکتی ہے
ہاں نہیں ہے تو نہیں میری روانی میں رکاؤ

قدر دنیا کو دمِ صبحِ ازل سے ہے میری
لیکن اب جیسی ہے آگے تھی یہ چاہش نہ یہ چاؤ

گنجِ مقصود کی کُنجی ہوں حقیقت یہ ہے
رکھ کے قابو میں مجھے گنج و خزائن ہتھیاؤ

مجھ کو کھویا ہے تو کھوئے گئے دنیا سے تم آپ
دم غنیمت ہے،اسے، مجھ کو گنوا کر نہ گنواؤ

علم[۱]

علم کہتا ہے وہ ہوں جوہرِ اعلیٰ و لطیف
مجھ سے انسان کو شرف مجھ سے شرافت کو بناؤ

میری تنویر سے ہے چشمِ بصیرت روشن
میری توسیع سے ہے نقدِ ہنر کو پھیلاؤ

میں ہی حیوان کو انسان بنا دیتا ہوں
ابنِ آدم میں دکھاتا ہوں ملائک کے سُبھاؤ

خیر و شر کی ہے زمانے میں مجھی سے تو تمیز
نیک و بد کے ہیں مجھی سے یہ مُمَیِّز برتاؤ

کس سے بندوں کو ہوا خالقِ اکبر کا خیال
کس سے خلعت کو ہوا جانب خلاق جھکاؤ

اُطْلُبُوا الْعِلْم پیمبر نے کہا ہے سن لو
فرض ہے میری طلب اس میں کبھی جی نہ چراؤ

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ سے ظاہر ہے یہی
آدمی ہی وہ نہیں جس کو نہیں مجھ سے لگاؤ

حاصلِ مزرعِ اوقات ہوں ماشاء اللہ
میری خدمت سے نہ اکتاؤ نہ دل کو اچٹاؤ

تھا کبھی زیورِ افرادِ بشر دُنیا میں
آج کل زیست کا ٹھہرا ہے مجھی پر ٹھہراؤ

کوئی بےعلم زمانے میں نہ ہونے پائے
آج کل کا یہی فتویٰ ہے جس اقلیم میں جاؤ

گئے وہ دن کہ جہالت کی عملداری تھی
اب تو ہر دخل و عمل کا ہے مجھی پر اٹکاؤ

وہ گیا دور کہ تھا پڑھنے پڑھانے تک علم
اب تو یہ ہے کہ جو سونچو اسے کچھ کر کے دکھاؤ

مجھ سے دولت کو ترقی ہے ہنر کو رونق
میرے دم سے ہیں یہ دنیا کے سنگار اور بناؤ

میں وہ ہوں صاحبِ طاقت کہ مسلّم ہے یہاں
طاقتیں جتنی ہیں سب پر میری طاقت کا دباؤ

صنعت وایجاد

اک طرف صنعت و ایجاد بھی ہیں دعویدار
سلسلے ان کے زبردست ہیں ان کو نہ تڑاؤ

علم کے ہیں کہیں پیچھے تو کہیں آگے ہیں
علم ہی علم کے ہیں گرد انہیں گھوم گھماؤ

ہے تجارت کو ترقی کو توَسُّل ان سے
عیش وعشرت کو اگر ربط ہے دولت کو گھراؤ

شعبدے ان کے فسوں اور ہیں نیرنگ طلسم
ان سے پانی میں چلے ریل تو خشکی پر ناؤ

وہ دکھائیں جو نہ دیکھا ہو کبھی آنکھوں نے
ان کے اک دستِ ہنر میں ہیں ہزاروں ہی بناؤ

خوب دیکھا تو یہ ہے علم کی ساری برکت
اسی سورج کے چمک کے ہیں یہ سارے چمکاؤ

جس قدر علم کو جس ملک میں ہے آج عروج
اسی مقدار سے ہے اس کو گھٹاؤ اور بڑھاؤ

ق

قدر جس ملک میں بِالذّات نہیں ہے اس کی
کچھ یونہی سا ہے جہاں پڑھنے پڑھانے سے لگاؤ

اس کے باشندوں کو اب حکم یہ ہے دنیا کا
دال فے عین ہو دنیا سے ابھی یارے واؤ

سیر میں سیر بہاروں میں بہاریں کیا کیا
زندگی ہے کوئی آزاد کہ دریا کا بہاؤ

ہندوستانیوں کے جاہ وجلال کا افسانہ

اللہ اللہ! آج ہے اُس قوم پر اپنی نگاہ   جس کے جز رومد سے دِل پانی لبوں پر آہ آہ
نرم، نازک، سخت، سرکش، گند، مدھم، تند، تیز   ابر و خاطف، باد وباراں، برگ شبنم، کوہ وکاہ
جلوۂ نیرنگ سامانِ طلسم! عجوبہ کار   سحرفن، سحر آفریں، جادو طراز افسوں پناہ
خشم گیں خاطر شکن، خوں ریز خوں آشام خام   پختہ کارِ آشتی پیوند، مصلح، صلح خواہ
مرکزِ اوہام و جہل و بغض وسہو ولہو ولغو   مصدرِ اخلاق وعلم وحلم وفضل وعزّ و جاہ
اختراع، ایجاد، صنعت، حکمت و تدبیر وفن   سب میں اکمل سب میں افضل، سب میں بالا دستگاہ
طب، ریاضی، ہیئت وحکمت، فلاحت ہندسہ   سب کے کھوج اس نے لگائے، سب کی کھولی شاہراہ
کیمیا سازی و موسیقی، تصوّف، عشق وجوگ   سب کے سوت اس نے نکالے، سب کی لی پھر اس نے تھاہ
رزم دنیا میں مہابھارت سے بڑھ کر ہو کوئی   بزم پر ادنیٰ سا اندر کا، اکھاڑا ہے گواہ
بانکے، ترچھے، ٹیڑھے، تیکھے، ہیں جہاں کچھ کم نہیں   سیدھے سادے، بھولے بھالے، صاف دل، روشن جباہ
نازنین انداز میں، رفتار میں، گفتار میں   حُسن منت کش تو اس پر لوٹ چشمِ مہر و ماہ
کتنے فرّخ فر، سکندر بخت، دارا دبدبہ   کتنے اس میں جم حشم، کتنے فریدوں بارگاہ
مانگتا ہے، صد بدخشاں لعل اِک اِک ژندہ پوش   تاکتا ہے صد فلک دستار اِک اِک کج کلاہ
اس کے درویشوں کی دولت کے گدا، اہلِ دول   اس کے دولتمند کے محتاج دولت بادشاہ
ہند پر کس کی نہ ٹپکی رال، ہاں اِس ہند نے   دولتِ اغیار پر ڈالی نہ اپنی اک نگاہ
اپنی کملی میں سدا المست اِس کے مرد وزن   اپنے گھر میں بادشاہِ وقت اس کے روستاہ
اس کے عابد، اس کے زاہد وہ مورّعِ نفس کُش   جن کی چشم حق پرستی میں ثواب اپنے گناہ
حق پرستی پر، بنائے بُت پرستی اس کی ہے   رام رام اس کی ہے حق حق کی جگہ شام وپگاہ
یہ بھی تھی دنیا میں اہلِ حلّ وعقد ورتق وفتق   یہ بھی رکھتی تھی دلِ آگاہ وچشمِ انتباہ

آہ وہ نوروز، وہ رونق، وہ شوکت، وہ عروج   حیف یہ پستی، یہ عسرت، ویل یہ روزِ سیاہ
آج شدر ان کو کھویا آریا ورتی کہو
کچھ کہو، پر اے مسلمانو، خدا لگتی کہو

وہ شجر تھا کون جو با برگ و باراں میں نہ تھا   سب گلِ بے خار تھے، کوئی بھی خار ان میں نہ تھا
کون سا وہ علم تھا، جن پر نہ تھا اِن کو عبور   کیا وہ فن تھا، جن میں فخرِ روزگار اِن میں نہ تھا
کون سا بازارِ علم وفن وہ تھا، جس کے لئے   گوہرِ خوش آب ونقدِ خوش عیار ان میں نہ تھا
نظم میں، تدبیر منزل میں، کہو، کس بات میں   مردِ کار اِن میں نہ تھا یا پختہ کار اِن میں نہ تھا
شہرۂ آفاق ہیں، اس کے رشی اِس کے منی   کون تھا جو عابد شب زندہ داراں میں تھا
معرکے ہیں رزم کے شاہد، کہے کیونکر کوئی   روستم اِن میں نہ تھا، اسفندیار اِن میں نہ تھا
کوئی کہدے اِن کی ہمّت، ان کی طاقت دیکھ کر   حوصلے کے پست تھے، اسفندیار اِن میں نہ تھا
اِن کے افسانے نہ کہنے دیں تو پھر کیونکر کہوں   اقتصاد اِن میں نہ تھا، عزم و وقار اِن میں نہ تھا
کس نے دیکھی نظم کالی داس کی، جو کہہ سکے   شاعرِ معجز بیاں جادو نگار اِن میں نہ تھا
رہ گیا تھا کون سا میدانِ فن جس میں اِک ایک   یکّہ تازِ سرفرازی شہ سوار اِن میں نہ تھا
شش جہت میں، اعتبارِ علم وفن تھا سِکّہ زن   بے ہنر اِن میں نہ تھا، بے اعتبار اِن میں نہ تھا
آپ کھاتا تھا کھِلا کر چار کو اِن کا غریب   رزق کے ہوتے کوئی دِل بے قرار اِن میں نہ تھا
اتفاق آپس میں، یا ہمدردیاں ان میں نہ تھیں   تال میل اِن میں نہ تھا، اخلاص پیار اِن میں نہ تھا
تھی کدورت برطرف، کینے سے سینے پاک تھے   آئینے تھے دل کے صاف اصلاً غبار اِن میں نہ تھا
کذب کا بازار ٹھنڈا تھا یہ تھی صدق و صفا   بے رعا تھے رُو ریا کا کاروبار اِن میں نہ تھا
گرم تھی منصور کی بھٹی اِنہیں کی ذات سے   مستِ ذکرِ حق تھے سب، اِک بادہ خوار ان میں نہ تھا
بات کے پکّے تھے ایسے نہ نگہدارِ عہود   بے وفا ظالم کا، کوئی غمگسار اِن میں نہ تھا
آہ وہ شائستگی اللہ وہ تہذیب عام   ایک بھی، لاکھوں، کروڑوں میں گنوار ان میں نہ تھا
تھے یہی ہندو کہ جو نکھرے ہوئے تھے بال بال

اب یہی ہندوئے گیسو ہیں سو وہ بھی خال خال

اب بھی اپنی عقلِ بالغ سے اگر کچھ کام لیں
تھام لیں سب اپنی پگڈنڈی، خدا کا نام لیں

فکرِ آسائش پہ اقدم جان لیں رنجِ تلاش
کام کرنے کے کریں اوّل تو پھر اِنعام لیں

سعیٔ محنت پر ہے، اجرِ کامیابی کا مدار
اپنے ہاتھوں اپنے کاموں کے موافق دام لیں

بے کئے کچھ خاک بھی ہات آنے والا تو نہیں
کام دکھلائیں، پھر اپنے دام لیں، اِنعام لیں

اِن سے غیراقوام نے لی ہے جو اِمدادِعلوم
وہ دیا اپنا جو لے سکتے نہیں تو دام لیں

ہم مسلمانوں کو دیتے ہیں جو یہ اِلزام مفت
اِس سے بہتر اپنے اوپر آپ یہ اِلزام لیں

دل سے نفرت کو مٹائیں، دوستی پیدا کریں
نام اُچھلے حُسنِ نیت سے کچھ ایسے کام لیں

ہم مسلماں کیا ہیں اِک حرفِ غلط آفاق میں
یہ سمجھ لیں اور دادِ آگہی مادام لیں

کفر یا اسلام دونوں کی ہیں شاخیں ایک سی
اِک طرف یہ کفر توڑیں اِک طرف اسلام لیں

دونوں مل جائیں تو پھر دکھلائیں اعجازِ مسیح
مُردوں کو زندہ کریں، گرتے ہوؤں کو تھام لیں

مت بدل دینی ہے لازم، دل بدل دینا ضرور
کروٹیں لینی مقرر، صبح لیں یا شام لیں

ہم مسلماں آہ کیا تھے اور پھر کیا ہوگئے
ہم وہ مضموں ہیں کہ عبرت ہم سے خاص وعام لیں

ہم تو ہیں ٹھہرے ہوئے مردودِ درگاہِ الٰہ
اب تو چھی جی ہماری لیں خبر یا رام لیں

وہ جو تھے وہ تو نہ ہم ہوں گے نہ یہ ہونے کو ہیں
ہاں بچا لیں گے مگر آگے جو کچھ کھونے کو ہیں

سرسید مرحوم

کسی نے ملک چھوڑا یا کسی نے بوریا چھوڑا
مرے سیّد نے نامِ نیک چھوڑا واہ کیا چھوڑا

نہ چھوڑا گر خزانہ کوئی الماس و جواہر کا
خیالات اپنے چھوڑے معدنِ صدق وصفا چھوڑا

نہیں روشن دماغی کم کبھی کانِ جواہر سے
مگر اس سے گراں قیمت خلوصِ بے ریا چھوڑا

نہ دیکھیں کس طرح حسرت سے ہم خدماتِ قومی کو
کہ سرتاسر انہیں آئینۂ مہر و وفا چھوڑا

نمونہ اپنا چھوڑا رہبرِ کامل خضر صورت
تصانیف اپنی چھوڑی چشمۂ آبِ بقا چھوڑا

رواں چھوڑیں جو اسپیچوں سے نہریں خیر جاری کی
مؤثر لکچروں سے باغِ فیضِ دلکشا چھوڑا

بچایا فلسفی حملوں سے اسلامی مسائل کو
جو تفسیر اپنی چھوڑی قلعہ اِک فولاد کا چھوڑا

نہ دیکھا تھا کبھی جو فلسفے کی تیز آنکھوں نے
وہ اصلی جوہر اسلامی صداقت کا دکھا چھوڑا

تعصب جزءِ اعظم تھا جو اسلامی عقیدت کا
وہ اک آتشکدہ تھا حق پسندی سے بجھا چھوڑا

خدا جانے پڑے سوتے تھے ہم کس خوابِ غفلت میں
وہ کڑکا اس نے کڑکا یا کہ سوتوں کو جگا چھوڑا

مذاقِ اہلِ مشرق بے خبر تھے ان کی لذّت سے
علومِ مغربی کا ذائقہ اِن کو چکھا چھوڑا

قلم اس نے اُٹھایا یا قلم اٹھنے لگے سب کے
نئی تحقیق و تحقیقات کا لگّا لگا چھوڑا

نہ وہ منطق رہی قائم نہ وہ کٹ حجّتی باقی
رُخِ معنی سے ہر دھوکے کے پردے کو اُٹھا چھوڑا

زمانے کی ہوا پہچانتا تھا آخر آخر کو
جو ضدّی ہٹ دھرم سرکش تھے سر اُن کا جھکا چھوڑا

ہدایت کو چلے تھے ہو گئے خود پیروِ سیّد
موافق یا مخالف سب کو رستے پر لگا چھوڑا

بھڑکتے تھے جو سائے سے کبھی تہذیب یورپ کے
چراغ اک دِن اسی تہذیب کا گھر گھر جلا چھوڑا

معانی حبِّ قوم، اصلاحِ قوم، امدادِ قومی کے
نئے پہلو نئے عنوان سے سب کو بتا چھوڑا

برابر تھا بلند و پست اسے اغراضِ قومی میں
نہ ایوانِ شہی چھوڑا نہ ٹوٹا جھونپڑا چھوڑا

لگائی لاٹری اسٹیج پر آیا تھیئٹر میں
نہ بانکوں کی ادا چھوڑی نہ بڈھا چوچلا چھوڑا

جہاں تک ہاتھ پہنچا ہاتھ مارا اس کی ہمت نے
نہ جیبِ اوستا چھوڑی نہ گنجِ اغنیا چھوڑا

نہ تھا فرماں روا لیکن قلم کے زور سے اُس نے
دلوں پر سکہ اک فرماں روای کا بٹھا چھوڑا

لگانا تھا اُسے جو باغ اپنے جود و اِحساس کا
وہ اپنی ہمت اپنی استقامت سے لگا چھوڑا

اگر ہو دیکھنا اِک جھونپڑے میں خوابِ محلوں کا
علی گڑھ جاکے دیکھو بےنظیر اک مدرسا چھوڑا

لگائی تھی جو شاخِ تربیت تعلیم کے شامل
اسے شاداب چھوڑا اور اسے پھولا پھلا چھوڑا

نئی اِک رُوح پھونکی قوم میں اس کے تتبع نے
ہر اک اصلاح کو اک مصلح معجز نما چھوڑا

جو دولت سب سے بڑھ کر اس نے چھوڑی وہ یہ دولت ہے
کہ اپنے پیروؤں کا اِک گروہِ پیشوا چھوڑا

یہ سب چھوڑا تو چھوڑا قوم کو آزاد سید نے
یہی اک درد چھوڑا اور دردِ لا دوا چھوڑا

رحلت محسن الملکؒ

محسن الملک خدا دے تجھے خدمت کی جزا
شافعِ روزِ تیری وفا کوشی ہے

قوم کی دھن میں جوانی سے بڑھاپا کاٹا
آج سب جھگڑوں سے فرصت ہے، سبکدوشی ہے

تیرے احسان تیری یاد، بھلانا دل سے
خونِ انصاف ہے، احسان فراموشی ہے

حشر تک تیری صداؤں سے ہوئے ہم محروم
بزم سنسان ہے، خاموشی ہی خاموشی ہے

نہ وہ بلبل کے ترانے، نہ چمن کا وہ رنگ
اب نہ وہ راز کی باتیں، نہ وہ سرگوشی ہے

ایک قائم ہے زمانے میں، یہ ماتم تیرا
دن کی پوشش میں نہاں شب کی سیہ پوشی ہے

تیری رحلت نے قیامت سی قیامت ڈھائی
جن میں کچھ ہوش تھا اب ان کو بھی بیہوشی ہے

بعد سیّد تری خدمات کو سیّد ہی کہیں
یہ وفا کوشی ہے، یا وعدہ فراموشی ہے

تجھ کو ان باتوں سے کیا، اب تو ہے عالم ترا اور
اِک نئی شانِ تجلّی سے ہم آغوشی ہے

زیارت شبیہ غفران مآب نوّاب محسن الملکؒ

رحمت اللہ کی، او جی[2] سے گزرنے والے
اِک ترے مرنے سے سب مرگئے مرنے والے

کر دیا صاف ترے صدق وصفا نے روشن
خاک میں مل کے نکھرتے ہیں نکھرنے والے

بگڑی ایسی کہ تو بنائی کہ سنوارا سب کو
اِس قدر جلد نہ تھے کام سنورنے والے

وہ مہذب نظر آتے ہیں خدا کی قدرت
جن بزرگوں کے چلن تھے نہ سدھرنے والے

قوم کی دھن جو سمائی تو گئی جان کے ساتھ
جان سے، مال سے، انکار نہ کرنے والے

ہائے جی بھر کے نہ دیکھا، تمنا ہی رہی
مرکے بھی آنکھوں سے دل دل میں اُترنے والے

ٹوٹتی ہے تری رحلت سے اب انگاروں پر
سنگدل وہ کہ جو سِل سینے پہ دھرنے والے

جس نے دیکھا ہے علیگڑھ، وہی سمجھے یہ درد
اب یہ ناسور تو شاید نہیں بھرنے والے

نقش بر آب جہانِ گزران کے نقشے
کل مٹے، آج مٹے، کب ہیں ٹھہرنے والے

آہ! قینچی سی زباں، اب وہ نہیں کیوں چلتی؟
اپنی اسپیچوں میں او پھول کترنے والے

محسن الملک! رہیں گے ترے سب احساں یاد
معترف تیرے نہیں تجھ سے مکرنے والے

'حیدرآباد' بھی اِس در سے خالی نہیں آہ!
سر پٹکتے ہیں تری یاد میں مرنے والے

زندگی بھر تو بڑی قوم کی رکھوالی کی
کیا خبر! اب جو گزرتی ہے گزرنے والے

داغ ایسا ہی یہ بیٹھا ہے کہ دل بیٹھ گئے
اب جو بیٹھے نہیں ہرگز وہ اُبھرنے والے

نیکیاں چوم کے تصویر تری کہتی ہیں
مرحبا، موت کی سختی سے نہ ڈرنے والے

پھول کُملا گئے آزؔاد چلی بادِ خزاں
سارے شیرازے ہیں اکز روز بکھرنے والے

ذرا اِس کی ابتداء اور انتہا کو دیکھو

اے راتوں کو چمکنے والو
چھوٹے چھوٹے چمکتے تارو

مونس و رہبر دگیروں کے
ہمدم بچوں اور بوڑھوں کے

میں حیراں ہوں آخری کیا ہو
تم پکھراج ہو یا ہیرا ہو

کیوں نہیں آ جاتے ہو زمیں پر
کیا کرتے ہو چرخ بریں پر

پاس چلے آؤ تو مزا ہو
دور پڑے یوں جھانکتے کیا ہو

چمکو چمکو رات تمام
سچا ایک خدا کا نام

ہے سنسان پڑا سنسارا
چار پہر ہے راج تمہارا

ہاں مجھ کو اتنا تو بتاؤ
صبح کو تم ہو جاتے کیا ہو

مار دیا کس شوخ نے آنچل
کرنے لگے تم جھلمل جھلمل

دیر نہیں اب رستہ پکڑو
چند منٹ بس اور چمک لو

رات نہیں اب شب ہے آخر
راہ لگے سب اپنے مسافر

آنے لگی آواز جرس کی
آنکھیں کھلیں مرغانِ قفس کی

سرد ہُوا بازار قمر کا ٹھنڈا ہوگیا صبح کا تارا
دوڑ چلی ہے سفیدی کیسی پھر گئی روئے زمیں پر چاندی
بڑھتا آتا ہے نور کا دریا روشن ہوگیا عالم سارا
کوئی کہیں اور کوئی کہیں ہے صبح ہوئی اب رات نہیں ہے
بول چلا اب مرغِ سحر بھی بجنے لگے نوبت بھی گجر بھی
محوِ عبادت شیخ و برہمن وجد میں ہر سو طائرِ گلشن
کس انداز سے باری باری تانیں لیتے ہیں پیاری پیاری
ٹھنڈی ہوا وہ وقت سہانا چڑیوں کا وہ شور مچانا
بلبل کی وہ نغمہ نوازی اور پپیہا کی دمسازی
قمری کی وہ صدائے کو کو دلکش وہ پھولوں کی خوشبو
اُبھری ہوئی وہ چمن کی کیاری صنعتِ حق کی وہ گلکاری
بھیگی ہوئی شاخیں شبنم سے جھوم رہی ہیں آگے پیچھے
پھول بھری وہ نازک شاخیں جُھک جاتی ہیں دائیں بائیں
ناچ رہی ہے بادِ بہاری چاروں طرف ہیں نہریں جاری
پھُول کہیں کملائے پڑے ہیں نخلِ چمن شرمائے کھڑے ہیں
ہوش اُڑے ہیں یاں بلبل کے خوں سے بھرے ہیں دامن گُل کے
روح افزا ہیں لالہؔ و جوہی توبہ شکن ہے بانگِ صبوحی
لا کوئی ساقی جلد اُٹھا کر مَے کی صراحی برف لگا کر
دیکھ کھُلے وہ درِ میخانہ چھیڑے ہے کوئی چنگ و چغانہ
بھیرویں کوئی تان رہا ہے سب کا ایک انداز جدا ہے
بھرتے ہوئے میخوار ترانہ جھومتے جاتے ہیں مستانہ
اک قطرہ بھی خُم میں نہ چھوٹے شیخ کی یارب نیند نہ ٹوٹے

۱؎ دکن ریویو، نمبر۱، جلد۲، ص۳۴، نومبر ۱۹۰۷ء

پی لیں گے سب دِن کے بدلے آج مگر خورشید نہ نکلے
یوں تو جہاں میں ہیں لاکھوں ہوگی آج کی ایسی صبح نہ ہوگی
چاروں طرف یہ دھوم مچی ہے ''صبح کہیں ایسی بھی ہوی ہے''
ڈوڑ چلی ہے شفق کی سرخی چھائی ہوئی ہے شمع پہ زردی
وقتِ سحر وہ بزم میں ہلچل اور جھاڑوں کی وہ جھلمل جھلمل
فراشوں کا وہ آنا جانا جلدی جلدی شمع بجھانا
اڑتے پھرتے ہیں لیمپ کے کیڑے باسی پڑے ہیں پان کے بیڑے
رات کے جاگے سوئے ہوئے ہیں اپنے مزے میں کھوئے ہوئے ہیں
بیٹھا کوئی اونگھ رہا ہے نیند سے کوئی چونک پڑا ہے
کوئی لگائے منھ میں حُقّا دیکھ رہا ہے ناچ تماشا
اے مرے پیارے اُٹھ جا اُٹھ جا تو بھی تماشا دیکھ ذرا سا
ناچ رہی ہیں بی بی کسبَن سب کو دکھا کر اپنا جوبن
کِرکٹ کِرکٹ کِرکٹ تائیں ان میں سے کس کو دام میں لائیں
گڑبڑ گڑبڑ دھائیں دھائیں گدھے بیٹھے ہیں دائیں بائیں
ڈِر ڈا، ڈِر ڈا، ڈاڈا ڈارا آنکھیں لڑیں اور وہ مارا
یار میرا ابلیسِ لعیم تاتا دھیم، تاتا دھیم
دَم بھر میں جھٹ پٹ جھٹ پٹ کر جاؤں گی سب کو چٹ
تاق دِھنا دِھن تاق دھنا خوب کرو تم لوگ زنا
طاق پہ رکھ دو شرم و حیا دھیم تنا دِھر دھیم تنا
کرکوں کرکوں ٹُن ٹُن ٹُن یار کروں گی میں چُن چُن
چھَم چھَم چھَم چھَم چھَم چھَم چھَم چھَم سب اس آگ میں ہوں گے بھسَم
سُونگ تاپ روپے کی ڈنڈی بیچو گاؤں منگاؤ رنڈی

خوب کرو تم مِسّی لگائی
دمڑی کی بلبل دُکڑا چُتھائی

فرصت فرصت فرصت ہے
چند دنوں کی دولت ہے

سر پہ جب تک زر کی ٹوپی
تم ہی سجن ہو تم ہی گوپی

جب نہ رہا کچھ کیسی یاری
پھر وہی لہنگا پھر وہی ساری

نِفرت نِفرت نِفرت ہے
ایسی سمجھ پر لعنت ہے

پھبتی نہیں ہے تم کو بڑائی
ہار چکے تم صاف لڑائی

توندی تُول مَہوُ کا پیڑا
ہے منجدھار میں قومی بیڑا

اتّل پتّل گھونگھا ساری
ڈوب رہی ہے ناوٗ تمہاری

شرم نہیں ہے ننگ نہیں ہے
ہائے تمہیں کچھ ڈھنگ نہیں ہے

چل نکلا ہر گونگا بہرا
عِلم مئے تم کو پر نہیں بَہرا

گھیرے ہوئے ہے تم کو جہالت
چھائی ہوئی ہے تم پر غفلت

اوس سے اپنی پیاس بجھاؤ
گھر میں بیٹھے مرغ لڑاؤ

فارسی پڑھ کر بیچو تیل
یہ دیکھو قسمت کا کھیل

ناوِل لکھ کر تمغے پاؤ
طبلہ چھوڑ مردنگ بجاؤ

کود چکی نا کُند بچھیڑی
کھُل گئی ساری حقیقت تیری

اے تجھ پر ہو خدا کی مار
گھر کی بلّی گھر میں شکار

بوڑھے پر عقل نہ آئی
پھیلی ہوئی ہے تم میں لڑائی

آگئی خوں میں کیسی سفیدی
غیرت تجھ میں نہیں ہے ذرا بھی

جاتی رہی ہے تجھ سے حمیت
تو نے ڈبو دی اپنی عزت

جوتیاں کھاتے پھرتے ہو سب کی
جون بھی کانوں پر نہیں رینگی

صبح کو ہر سو دھوم مچی ہے
اب تک خوابِ ناز وہی ہے

اوج پہ ہیں سب چیل اور کوّے
تم غفلت میں پڑے ہو سوتے

گھر کی ہانڈی لے گیا کتّا
تم کو اِس کی کچھ نہیں پروا

کس سے کہوں اے عرش کے بانی
گھر کی لونڈی ہو گئی رانی

دوست بھی اپنا ہو گیا دشمن
جس کو پیا چاہے وہ سُہاگن

مار بھی کھائیں رونے نہ پائیں
کھیوا دیویں بہے بھی جائیں

پر یہ غلط ہے شکایت میری
بند نہیں یاں رہا کسی کی

ہاں غفلت سے سر تو اُٹھاؤ
کر سکتے ہو پھر جو چاہو

ورنہ یہی ہے سب سے بہتر
کیسا جھاڑ اور کیسا منتر

آدل پھاٹے بادڈ پھاٹے
تم کو خدا دنیا سے اُٹھالے

تم کو برا پھر کون کہے کیوں
نامِ سلف پر داغ رہے کیوں

خیر بھلا جو ہوگی سو ہوگی
سُن لے جان نصیحت میری

دولتِ دنیا مال خزانا
چھوڑیں گے جس دَم ساتھ تمہارا

ہر تدبیر رہے گی قاصر
کوئی نہ کام آئے گا آخر

اس سے بھلا کس کو ہے رہائی
کرلے بندے نیک کمائی

قوم پہ جان و مال فدا کر
کوئی نہیں پھر تیرے برابر

رباعیات

توحید کی وہ اصل غرض ہے مفقود
طاعت سے مدّعا ہے ذاتی بہبود
کعبے سے غرض نہیں ربِّ کعبہ
انجام مدام ہے مآل و مقصود

☆

کیوں کر توحید شرک پر ہو غالب
مقصد میں تو ٹھہرے دونو ہی ہم قالب
جو کچھ کہ خدا سے مانگتے ہیں کفّار
مسلم بھی خدا سے ہیں اسی کے طالب

☆

دل کی آمد ہے اصل ایماں کیا ہے
ماحول کی معرفت ہے عرفاں کیا ہے
تفسیر کو اب شرط نہیں مبلغِ علم
ہے تختۂ مشق عام قرآں کیا ہے

☆

یہ سچ کی خدا کی یاد ہم بھولے ہیں
عاشا نہ کوئی قول وقسم بھولے ہیں
پورے تو ادا ہوئے نہ بندوں کے حقوق
بندوں کو خدا سے پھر بھی کم بھولے ہیں

☆

توحید کی وہ اصل غرض ہے مفقود
طاعت سے مدّعا ہے ذاتی بہبود
کعبے سے غرض نہیں ربِّ کعبہ
انجام مدام ہے مآل و مقصود

☆

کیا تجھ کو دیا خدا نے رتبہ مسلم
تجھ کو یہ پرستش نہیں زیبا مسلم
طاعت میں خلوص کے اشارے کو سمجھ
کیا بت کی طرح خدا کو پوجا مسلم

☆

جب نطق سے محروم رہی کیا ہوتی
بے ناطقہ بے زباں رسوا ہوتی
آزاد ہم اس کی تو پرستش کرتے
تصویر بھی شاعر کی جو گویا ہوتی

☆

آئے ہیں کہ ہمدرد بنائیں گے تمہیں
اک درد کی داستاں سنائیں گے تمہیں
ہنس ہنس کے بہت تم نے رلایا ہم کو
رو رو کے آج ہم رلائیں گے تمہیں

☆

ہر سبز گیاہ کو نہ سنبل کہیے
ہر برگِ شجر کو نہ کبھی گل کہیے
گل پر جو چہک اٹھے نہیں وہ بلبل
دل زمزمہ سنج ہو تو بلبل کہیے

☆

ہستی کا سراغ کچھ ملا کچھ نہ ملا
ہم کون ہیں ان کا بھی پتا کچھ نہ ملا
لائی مجھے زندگی عدم نے ناحق
جینے کا بُرا بھلا مزا کچھ نہ ملا

☆

ہر چند ثنا خواں ہے خدائی تیری
پر حمد کسی سے نہ بن آئی تیری
ہر ذرّہ کو دعویٰ ہے کہ ہوں میں خورشید
اللہ رے شان کبریائی تیری

☆

مسجود ملک کیا خدایا تونے
کیا مرتبہ خاک کا بڑھایا تونے
احسان ترے بیاں کیا ہوں خالق
سو شکر کہ آدمی بنایا تو نے

☆

اس نکتے کو عارفانِ کامل سمجھیں
مشکل ہے کہ طالبانِ بے دل سمجھیں
آسان سمجھ لیا تو ہے سہل سے سہل
مشکل جبھی مشکل ہے جو مشکل سمجھیں

☆

سو طرح سے جی کو آزمایا تم نے
اب تک تو بہت دل کو بچایا تم نے
یہ آخری عمر میں پہنچ کر آزاد
کیا سوجھی تمہیں کہ دل کو لگایا تم نے

غیرت دہِ مہر و ماہ اب بھی ہیں یہاں
خوش قامت و کج کلاہ اب بھی ہیں یہاں
بستی یہ بسی ہوئی ہے نوّابوں سے
جھوٹوں کے بادشاہ اب بھی ہیں یہاں

☆

کوچہ میں تمہارے خانہ برباد ہے ایک
جس سے نہ ہوئے خوش دل ناشاد ہے ایک
سنتے رہے دوست ہو کہ دشمن سب کی
جس کی نہ سنی کبھی وہ آزاد ہے ایک

☆

جاگے تو بھلا کوئی کہاں تک جاگے
یہ دن تو ہیں ہر ایک بشر کے آگے
ممکن ہی نہیں اس سے مفر کی صورت
انسان مصیبت سے کہاں تک بھاگے

☆

عالم میں جو ہستی کی یہ ہیں تعمیریں
اک خواب کی ہیں جدا جدا تعبیریں
صورت میں ہے اختلاف ورنہ دراصل
ہیں ایک مصوّر کی یہ سب تصویریں

☆

قدرت کی بہار کے تماشے دیکھے
آنکھیں جو کھلیں تو اور نقشے دیکھے
ہر نقش میں سو طرح کے نقش آئے نظر
ہر جلوے میں سو طرح کے جلوے دیکھے

☆

اللہ کی رحمت ہوئی جن پر نازل
چٹکی جو کلی ہوا یہ نکتہ حاصل
دشوار نہیں بند شکستن آزاد
لاریب کہ ہے شکستہ بستن مشکل

کتابیات

بہار کے نظم نگار شعراء	قمر اعظم ہاشمی	بہار اردو اکادمی، پٹنہ	۱۹۸۸ء
تاریخ ادب اردو جلد اوّل	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۷ء
تذکرہ مسلم شعرائے بہار، حصہ اوّل	سید احمد اللہ ندوی	کراچی	۱۹۸۱ء
حقیقت بھی کہانی بھی	سید بدر الدین	بہار اردو اکادمی، پٹنہ	۲۰۰۳ء
سراج و منہاج	پروفیسر اختر اورینوی	ایوان اُردو، پٹنہ	۱۹۶۴ء
فضل حق آزاد بحیثیت نظم نگار	سید علی حیدر نیّر	حلقۂ شعر و ادب، پٹنہ	۱۹۶۴ء
فضل حق آزاد: عصر، حیات اور فن	ڈاکٹر روحی حسن مجید	سائنٹیفک پبلیشرز، پٹنہ	۱۹۸۰ء
فضل حق آزاد	متین عمادی	بہار اردو اکادمی، پٹنہ	۲۰۰۶ء
مطالعۂ آزاد	محمد ذکی الحق	بزم اردو، بی۔این کالج، پٹنہ	۲۰۰۳

رسائل و جرائد

الپنچ	پٹنہ	۸ر جنوری	۱۹۰۶ء
تاج	بانکی پور	۱۵ر ستمبر	۱۹۰۲ء
تاج	,,	۲۳ر ستمبر	۱۹۰۲ء
تاج	,,	۲۴ر ستمبر	۱۹۰۲ء
تاج	,,	۸ر دسمبر	۱۹۰۲ء
دکن ریویو	پنجاب	شمارہ۔۹	جلد۔۲
زبان و ادب	بہار اردو اکادمی، پٹنہ	نومبر ۲۰۱۲ء	
صدائے عام	پٹنہ	عید نمبر ۱۹۵۰ء	

ختم شد